علمی و ادبی لطیفے

قمر تسکین



علمی و ادبی لطیفے

قمر تسکین

رابعہ بک ہاؤس بخشی مارکیٹ انارکلی لاہور

ناشر: ——— نوید اے۔ شیخ
ادارہ: ——— رابعہ بک ہاؤس، لاہور
تعداد: ——— ایک ہزار
طابع: ——— ندیم یونس پرنٹرز، لاہور

قیمت 18 روپے

آپ کی ہنسی اور قہقہے

معالجین اور ماہرین نفسیات نے ہنسی، قہقہوں اور خوش مزاجی کے خوش گوار اور مسرت آگیں نتائج و فوائد بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ

• ذہن پر بار ناقابل برداشت ہو جائے تو ذہنی بار اور خلجان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہنسنے سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ذہنی دباؤ اور ہیجان سے چھٹکارا کے لیے ہنسنا سحر کا کام کرتا ہے۔

• ہنسنے ہی میں سب سے بہتر ہے۔ جی کھول کر اس طرح ہنسنا کہ جسم دہرا ہو کے رہ جائے۔ جذباتی اعتبار سے انتہائی فرحت بخش ثابت ہوتا ہے اس سے اندرونی کشمکش مٹ جاتی ہے اور جی ہلکا ہو جاتا ہے۔

• خوشگوار تاثرات کے ذریعے صحت مندی حاصل کرنا اور اپنی روح کو تازگی بخشنا مطلوب ہو تو خوب ہنسیں۔

• ہر انسان میں چند جذباتی تحریکیں ہوتی ہیں جنہیں ہنسی کے ذریعے اجاگر کرنا ضروری قرار پاتا ہے۔

• اداس، دلگیر، غمگین، تنک مزاج اور دہشت پسند اشخاص کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ آپ دل کھول کر قہقہے لگایئے۔ آپ کے چہرے پر آسودگی اور اطمینان کی جھلک نظر آئے گی اور آپ نہایت بشاش اور خوش نظر آئیں گے۔

• کینہ، نفرت، غم اور غصہ غرضیکہ ہمہ اقسام ذہنی پریشانی، جذباتی ہیجان و کشمکش کو دور کرنے کے لئے زوردار ہنسی اور بلند قہقہوں سے بڑی مدد ملتی ہے

• اگر ہنسی بالکل فطری ہو اور بے ساختہ طور پر آ جائے تو اس سے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں توازن اور تناسب قائم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے اور زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے والے اشخاص ان لوگوں سے زیادہ حساس اور ہمدرد ہوتے ہیں جو دنیا کے سامنے اپنے چہروں پر رنج، غم اور سنجیدگی کے جذبات کی نمائش کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

• آپ کی حس ظرافت وہ قوت ہے جس کے ذریعے آپ اپنا اعصابی تناؤ دور کر کے اپنی مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔

• انسان دوسرے حیوانات سے محض اس لئے ممتاز ہے کہ اس کی ہنسی ان سے مختلف ہے۔

• ہنسی نہ صرف قوموں کے لئے بلکہ افراد کے لئے بھی اہم ہے۔ کیونکہ اس سے انسانی فکر و نظر کی حفاظت ہوتی ہے۔

جاننا چاہیے کہ انسان کی ہنسی اور اس کے قہقہے اس کی صحت کو بہتر بنانے اور برقرار رکھنے کے لئے بہترین ٹانک ہیں۔ اگر کوئی انسان کسی ذہنی یا جسمانی نقص یا اخلاقی پابندی کے تحت اپنی مسرت کا اظہار اپنی ہنسی یا فلک شگاف قہقہوں سے نہیں کر سکتا تو وہ یقیناً کسی شدید جسمانی یا ذہنی عارضہ کا شکار ہے۔ معالجین اور ماہرین نفسیات کی رائے میں وہ شخص صحتی حالت سے بہتر نہیں ہے جو ہنسنے سے معذور ہے۔ وہ خواہ کسی مرض میں مبتلا ہو یا نہ ہو لیکن اس کی کیفیت یقیناً ایسے مریض کی سی ہے جو توجہ کا محتاج ہے۔

دراصل جب ہنسنے سے ہمارے اعصاب اور سینہ کا تناؤ دور ہو جاتا ہے

ملتی ہے۔ خصوصاً ہنسنے سے ہمارے معدہ اور سینہ کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ ہمارے زور سے ہنسنے اور اپنا بھاری سانس باہر نکالنے سے ہمارے جسم کے اندرونی تناؤ میں زبردست کمی واقع ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں ہم پھر جو گہرا سانس اندر لیتے ہیں تو ہمارا یہ فعل ہمارے جسم کے سارے حصوں کے خون میں آکسیجن کو اچھی طرح پہنچانے میں مدد معاون ثابت ہوتا ہے۔

ہماری سوسائٹی میں قہقہہ مارنے اور کھلکھلا کر ہنسنے کے خلاف چونکہ اخلاقی تعصب پایا جاتا ہے اس لئے ہم ہنسنے کی ضرورت و اہمیت سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ ہنسی ایک خوشگوار کیفیت ہے جو متعدی بیماری کی طرح دوسروں میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہمیشہ بلند آواز سے ہنسنا چاہئے۔ چپ چاپ ہنسنے والے لوگ نفسیاتی علاج کے محتاج ہوتے ہیں۔ جو لوگ خود پر ہنس نہیں سکتے۔ وہ کمزور ہوتے ہیں اور اپنی کمزوری کے باعث یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان سے بھی کوئی حماقت سرزد ہو سکتی ہے۔ اپنی خوشی اور پریشانی کے درمیان توازن قائم نہ رکھ سکنے والے لوگ بھی اعصابی مریض ہوتے ہیں۔

خواتین میں مردوں کی بہ نسبت ہنسنے کی بہتر صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اس لئے دنیا بھر میں مردوں کے مقابلہ میں خودکشی کرنے والی عورتوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اعصابی مریضوں میں بھی عورتوں کی تعداد میں خاصی کمی ہوتی ہے اور وہ مردوں سے زیادہ عرصہ تک زندہ بھی رہتی ہیں۔ جب یہ بات طے شدہ ہے کہ رجائیت حقیقتاً ایک گراں قدر انسانی خاصہ ہے اور ناپیکار قوت ہے۔ اور آپ کی ہنسی آپ کو نئی زندگی دیتی ہے تو آئیے زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ شروع کریں اور خوب جی بھر کر ہنسیں، قہقہے لگائیں۔

قمر تسکین

برجستگی کلام

مولانا ظفر علی خان اپنے دور کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک محفل میں مولانا ظفر علی خان ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ والی کرسی پر مولانا ابوالکلام آزاد تشریف فرما تھے۔ مولانا آزاد نے منتظمین کو پکارتے ہوئے پینے کیلئے پانی طلب کیا۔ فوراً ہی ایک سفید ریش بزرگ نے کونے میں دھری ایک میز سے پانی کا گلاس اٹھایا اور بڑی عقیدت سے مولانا آزاد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مولانا آزاد نے پانی کا گلاس ہاتھ میں لے کر برجستہ کہا۔

لے کے خود پیرِ مغاں ساغر و مینا آیا

یہ سن کر مولانا ظفر علی خان نے جن کا برجستگی کلام کے لئے ساری اردو دنیا میں جواب نہ تھا، فوراً گرہ لگائی اور فرمایا۔

ے کشو! شرم تمہیں پھر بھی نہ پینا آیا۔

یہ سننا تھا کہ سارے مجمع نے "واہ واہ" کے نعرے بلند کئے۔

سگ باش برادرِ خورد مباش

میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک کراچی میں سکونت پذیر رہا ہوں۔ جہاں میرا

ٹھکانہ میرے بچپن کے مخلص دوست حضرت سہبا لکھنوی کا دفتر ماہنامہ "افکار" تھا۔ جہاں مولانا رازق الخیری ایڈیٹر "عصمت" کراچی گاہے گاہے تشریف لایا کرتے تھے۔ مولانا رازق الخیری جب کبھی دفتر افکار تشریف لاتے تھے۔ کباب ہماری کمزوری تھی (اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن بھائی سہبا لکھنوی اسے کمزوری سے موسوم کیا کرتے تھے) یا کوئی دوسری نئے کھانے پینے کا پروگرام بن جاتا تھا۔ جس پر ہم تینوں سہبا بھائی اور ناصر نور الحسن مولانا رازق الخیری کی نیابت میں عمل پیرا ہوتے تھے ایک ایسی ہی دعوت شیراز میں مولانا رازق الخیری نے حسب ذیل لطیفہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے کہا

"مولانا شوکت علی کھانے پینے کے بے حد شوقین تھے۔ ایک بار ابا جان (مولانا رازق الخیری کے والد محترم مولانا راشد الخیری مرحوم) نے علی برادران مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو نہاری کی دعوت دی۔ علی برادران تشریف لائے۔ کھانے پینے کی ابتدا ہوئی تو مولانا محمد علی (مرحوم) نے اپنی پلیٹ میں نلی سے گودا نکال الگ رکھا ہی تھا کہ مولانا شوکت علی نے انہیں مخاطب کرکے روٹی دینے کے لئے کہا۔ مولانا شوکت علی نے چپاتیوں میں سے چھانٹ کر ایک عمدہ سی سکی ہوئی چپاتی نکالی اور مولانا محمد علی کی طرف بڑھا دی۔ پھر فوراً ہی انہوں نے اپنی پلیٹ پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ مولانا شوکت علی نے ایک ہی نوالہ میں وہ سارا گودا صاف کر دیا تھا۔

یہ دیکھ کر مولانا محمد علی نے قہقہہ بلند کیا اور بولے۔

"سگ باش برادرِ خورد مباش"

غلطی سے

شوکت تھانوی کہتے ہیں۔

میں نے شعر کہنا شروع کیا تو بالکل نوعمر تھا۔ میں نے بڑی کوشش سے ایک غزل لکھی اور رسالہ "ترچھی نظر" میں چھپوادی۔ اس غزل کا ایک شعر یہ تھا۔

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچے میں جا کر ہم ذلیل و خوار ہوتے ہے

ایک روز میرے والد نے رسالہ "ترچھی نظر" دیکھ لیا اور جب میری غزل پڑھتے ہوئے مندرجہ بالا شعر پڑھا تو سخت غیض و غضب کے عالم میں میری والدہ صاحبہ کو یہ شعر سنا کر بولے

"آخر اس آوارہ گرد کو اس کوچے میں جانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے خواہ مخواہ ذلیل و خوار ہوتا ہی کیوں ہے؟"

میری والدہ نے سہم کر والد صاحب کا غصہ دور کرنے کے لئے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "وہ آخر بچہ ہی تو ہے۔ غلطی سے چلا گیا ہوگا۔ اب میں منع کر دوں گی۔ تو پھر کبھی اس کوچے میں نہیں جائے گا۔"

والدہ صاحبہ نے میری صفائی پیش کی تو کہیں جاکر میری جان بچی اور میں پٹتے پٹتے بچا۔

اپنے لئے میم بیوی کیلئے صاحب

شوکت تھانوی یورپ کے سفر کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے ان

کا ایک دوست ملنے آیا اور ان سے استفسار کیا۔

" بھیا آپ روزانہ پریشان رہتے ہو ؟"

شوکت تھانوی بولے۔

" بھیا! کیا پوچھتے ہو تمہاری بھاوج کی وجہ سے بہت پریشان ہوں میری روانگی کے پروگرام میں ابھی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ تم ولایت گئے تو وہاں سے تم میم سوکن لے آؤ گے، حالانکہ میں انہیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ اگر اپنے لئے میم لایا تو تمہارے لئے ایک صاحب بھی خرید کر لاؤں گا۔ لیکن یہ کسی طرح مانتی ہی نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ تم میم ضرور لاؤ گے۔ براہ کرم اب تم انہیں یقین دلا دو کہ میں اپنے لئے میم لایا تو ان کے لئے صاحب بھی ضرور لاؤں گا۔"

بے ادب

عدم نے اپنے نئے ملاقاتی سے پوچھا۔

"حضور کیا آپ ادب سے شوق رکھتے ہیں ؟"

ملاقاتی جو ایک مالدار تاجر تھا۔ بولا۔

" کبھی کبھار کوئی کتاب پڑھ لیتا ہوں یوں مجھے ادب سے کچھ زیادہ شوق نہیں ہے "

عدم نے فوراً کہا۔

" اس کا مطلب ہوا کہ آپ بے ادب ہیں۔"

تعاقب

ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔

سرسید احمد خاں ٹرین میں سفر کر رہے تھے کہ ان کے ڈبے میں ایک انگریز آکر بیٹھ گیا۔ سرسید کو ناگوار گزرا لیکن خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد انہیں بھوک محسوس ہوئی۔ تو انہوں نے اپنا ناشتہ دان کھول کر رکھا اور ہاتھ دھونے کے لئے غسلخانہ میں چلے گئے۔ لوٹ کر آپ نے دیکھا تو ناشتہ دان غائب پایا۔ دراصل انگریز نے ان کی غیر حاضری میں ناشتہ دان چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیا تھا۔ سرسید کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ پی گئے اور خاموش بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد انگریز اپنی سیٹ سے اٹھا اور غسل خانہ میں چلا گیا۔ انگریز کا ہیٹ سیٹ پر رکھا رہا۔ سرسید فوراً اٹھے، ہیٹ پکڑا اور چلتی گاڑی کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ انگریز لوٹا اور ہیٹ کو اپنی جگہ نہ پایا تو بولا۔

"ویل جنٹلمین ادھر ہمارا ہیٹ کدھر گیا۔"

سرسید نے فوراً کہا ——— "تمہارا ہیٹ میرے ناشتہ دان کے تعاقب میں گیا ہے۔"

ذی استعداد کاتب

حضرت اکبر الہ آبادی شاکی تھے کہ کاتب صاحبان اپنی غلط کاریوں سے جہاں صاحب مضمون کو دلی دکھ پہنچاتے ہیں وہاں قارئین کے لئے بھی تکلیف و اذیت کا سبب

بن جاتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے مولانا ظفر الملک علوی ایڈیٹر ماہنامہ "الناظر" کو ایک خط میں لکھا

میں اپنے مسودات خود پڑھنے سے قاصر ہوں اور کاتب میں اتنی بھی لیاقت کے ذہن استعداد ہونے کا اس سے اندازہ کر لیں کہ اگر مسودے میں "کونسلوں میں بیٹ" لکھا ہو تو وہ اسے "گھونسلوں میں بیٹ" پڑھ رہتے ہیں

قانون الہٰیہ کی کتاب

جوش ملیح آبادی کو ایک بار حکیم الامت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کا موقع میسر آیا تو وہ علامہ اقبالؒ کے در دولت پر پہنچے اور ملاقاتی کمرے میں داخل ہو کر دیکھا کہ علامہ اقبال کے سامنے کھلا ہوا قرآن پاک رکھا ہے اور وہ زار و قطار رو رہے ہیں۔

یہ دیکھ کر جناب جوش نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"علامہ صاحب کیا کوئی وکیل قانون کی کتاب پڑھتے ہوئے بھی روتا ہے"

سسرال کا مال

مولانا محمد علی سیتاپور کی ایک دعوت میں شریک تھے۔ اس دعوت میں مہاتما گاندھی بھی موجود تھا۔ میزبان نے مہمانوں کے سامنے پھل رکھے تو مولانا محمد علی نے یکے بعد دیگرے کئی خربوزے اٹھائے اور کھا گئے۔ یہ دیکھ کر مہاتما

گاندھی نے انہیں ٹوکا اور کہا۔

"ذیابیطس کے مریض کو شریفے آپ کو نقصان پہنچائیں گے۔"

مولانا محمد علی نے برجستہ جواب دیا۔

"گاندھی جی سسرال کا مال کبھی تکلیف نہیں پہنچاتا۔"

"سسرال کا مال؟" گاندھی جی نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں! مولانا محمد علی اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولے۔

"میں رام پور کا رہنے والا ہوں اور یہ شریفے سیتاپور کے ہیں، جو میرا سسرالی شہر ہے۔"

اُتارو جوتا

یہ قیام پاکستان سے قبل کا واقعہ ہے۔

میں اور اختر شیرانی جوتوں کی دوکان کالج بوٹ شاپ انارکلی پر پہنچے۔ اختر شیرانی کو جوتا خریدنا تھا۔ وہ چاہتے تو "کرناں شاپ" (جوتوں کی مشہور دوکان) پر پہنچ کر شیخ عبداللہ مالک (اس کے مالک) سے بآسانی دو تین جوڑے جوتے مفت لے سکتے تھے لیکن انہیں مفت مال لینے کی عادت نہ تھی۔ اس لئے وہ ایک ہندو کی دوکان "کالج بوٹ شاپ" پر پہنچے تھے۔ دوکاندار نے ہم دونوں کے سامنے جوتوں کے ڈھیر لگا دیئے لیکن اختر صاحب کو کوئی جوتا پسند نہ آیا دوکاندار طنزیہ لہجے میں بولا۔

"اتنے جوتے پڑے ہیں لیکن آپ اب بھی مطمئن نہیں ہوئے"۔

اختر شیرانی اس طنز کو سمجھ گئے اور فوراً ایک جوڑا پہن کر بولے

"بارہ روپے پیتے ہیا اتار رکھ دیا"

دادا نہیں دلدادہ

مرزا اسد اللہ خان غالب کے مخالف انہیں خطوط میں گالیاں لکھتے رہتے تھے ایک بار کسی مخالف نے انہیں ماں کی گالی لکھ دی۔ غالب اسے پڑھ کر ہنسے اور بولے

"اس بے وقوف کو گالی دینے کا شعور بھی نہیں ہے۔ بوڑھے اور ادھیڑ عمر شخص کو بیٹی کی گالی دینا چاہیئے تاکہ اسے غیرت آئے۔ جوان آدمی کو ہمیشہ جورو کی گالی دو کیونکہ اسے جورو سے بہت لگاؤ ہوتا ہے۔ اور بچے کو ہمیشہ ماں کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ سب سے زیادہ ماں سے مانوس ہوتا ہے۔

ایک نوعمر نے غالب کو ایک خط لکھا۔ جس میں اسے دادا کے لفظ سے مخاطب کیا۔ نوعمر نے اپنی دانست میں غالب کے ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھا تھا۔ لیکن غالب نے اس کے جواب میں اس نوعمر کو لکھا۔

"میاں میں تمہارا دادا نہیں ہوں بلکہ دلدادہ ہوں"

غالب کا حشر

ایک روز کا واقعہ ہے مرزا غالب اور ان کی بیگم بعد از موت عاقبت اور مغفرت کے مسائل پر بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ مرزا کی بیگم بولی۔

"روزہ رکھنا تو دور کی بات ہے آپ نے تو کبھی نماز بھی نہیں پڑھی اور عاقبت سنوارنے کے لئے کم از کم نماز روزہ کی پابندی سے ادائیگی اختیار کرنی ہی پڑتی ہے"

مرزا غالب نے جواب دیا۔

"آپ بلا شک و شبہ درست فرما رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی دیکھ لینا کہ آپ سے ہمارا حشر اچھا ہی ہوگا۔"

بیگم بولی۔

"وہ کیونکر؟ کچھ ہمیں بھی تو بتایئے؟"

"بھئی بات تو بالکل سیدھی ہے،" مرزا نے کہا۔ "آپ تو انہی نیلے تہبند والوں کے ساتھ ہوں گی جن کے تہبند کے پلوؤں سے اک بندھی ہوگی۔ ہاتھ میں ایک ٹونٹی دار بدھنی ہوگی۔ اور انہوں نے اپنے سر بھی منڈھوا رکھے ہوں گے۔ آپ کے برعکس ہمارا حشر یہ ہوگا کہ ہماری سنگت بڑے بڑے غیر فانی شہرت یافتہ بادشاہوں کے ساتھ ہوگی۔ مثلاً ہم فرعون، نمرود اور شداد کے ساتھ ہوں گے۔ ہم اپنی مونچھوں کو بل دے کر اکڑتے ہوئے زمین پر قدم دھریں گے تو ہماری دائیں اور بائیں اطراف چار چار فرشتے ہمارے جلو میں چل رہے ہوں گے۔"

آم پر غالب کا نام

ایک روز مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ آموں کے شاہی باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے اور بار بار درختوں پر لگے ہوئے آموں کی طرف غور سے دیکھنے جا رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے مرزا کو بار بار آم کے درختوں پر نظریں دوڑاتے دیکھا تو بولا۔

"بھئی مرزا تم بار بار درختوں کو کیوں دیکھ رہے ہو؟"

مرزا غالب نے بڑی انکساری سے عرض کی۔

"حضور بادشاہ سلامت بزرگوں سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ سو میں آموں کو بغور اس لئے دیکھ رہا ہوں کہ کسی آم پر میرا نام بھی درج ہے یا نہیں"

بادشاہ نے یہ سنا تو مسکرائے اور اسی روز عمدہ عمدہ آموں کا ایک ٹوکرا غالب کے گھر بھجوا دیا۔

گدھے آم نہیں کھاتے

مرزا اسد اللہ غالب آموں کے رسیا تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ آم عمدہ میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں تو کھانے میں لطف آتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے مرزا غالب کے گھر ان کے ایک عزیز دوست حکیم رضی الدین آئے۔ دونوں دوست باتوں میں مصروف تھے کہ گلی میں سے ایک گدھا گزرتا نظر آیا۔ دونوں نے دیکھا کہ گلی میں آموں کے جو چھلکے پڑے تھے گدھے نے انہیں سونگھا اور چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ حکیم رضی الدین یہ دیکھ کر بولے۔ "دیکھو مرزا! آم تو گدھے بھی نہیں کھاتے"

مرزا غالب نے فوراً کہا۔

"بجا فرمایا، بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔"

شیطان اور مرزا غالب

ایک بار ماہ رمضان میں مرزا غالب دن کے وقت اپنی کوٹھری میں بیٹھے شطرنج

کھیلنے میں مصروف تھے۔ شطرنج شیطانی کھیل کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس کے کھیلنے میں کافی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اتنے میں مرزا غالب کے ایک دوست ان سے ملاقات کے لئے آئے اور انہیں شطرنج کھیلتے دیکھ کر بولے۔

"بزرگوں نے تو کہا تھا کہ شیطان ماہ رمضان میں قید کر دیئے جاتے ہیں لیکن اب میں اپنی آنکھوں دیکھ رہا ہوں کہ شیطان تمہارے لئے کھلے ہیں"

مرزا غالب جھٹ بولے۔

"نہیں بھائی! بزرگوں نے واقعی سچ کہا ہے۔ شیطان واقعی قید ہے اور اس کوٹھڑی میں موجود اعتراف کرتا ہے کہ بزرگوں نے سچ کہا ہے!"

مرزا غالب کا یہ کہنے سے مطلب تھا کہ میں ہی تو شیطان ہوں۔

اپنے جوتے کا بچاؤ

ایک روز کا واقعہ ہے۔ ایک صاحب مرزا غالب سے ملاقات کے لئے آئے اور کافی دیر تک گپ شپ میں مصروف رہنے کے بعد شام کے وقت روانگی کے لئے آمادہ ہوئے۔

کافی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ مرزا غالب کے ملاقاتی جانے کے لئے اٹھے تو مرزا خود بھی موم بتی لے کر کھڑے ہو گئے۔ تاکہ ان صاحب کو جوتا تلاش کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔

مرزا کے ملاقاتی نے کہا۔

"مرزا صاحب! آپ بلاوجہ تکلیف نہ فرمائیں میں با سانی خود ہی اپنا جوتا

تلاش کروں گا،،

مرزا غالب جھٹ بولے۔

"حضرت آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں مرم تی محض اس خیال سے لایا ہوں کہ کہیں آپ غلطی سے اپنے جوتے کی بجائے میرا جوتا ہی پہن کر رفو چکر نہ ہو جائیں،،

سپردِ خدا

ریاست رام پور کے نواب کلب علی خان گورنر سے ملاقات کے لئے بریلی گئے تو مرزا اسد اللہ خان غالب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انہیں دہلی جانا تھا۔ بوقت روانگی نواب کلب علی خان نے مرزا غالب سے کہا۔

"مرزا صاحب الوداع خدا کے سپرد"

مرزا غالب جھٹ بولے۔

"حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا۔ اب آپ الٹا مجھے خدا کے سپرد کر رہے ہیں۔،،

چرچل کا ایک معتقد

سر ونسٹن چرچل کو جلد سے جلد پہنچنا تھا۔ اس لئے وہ ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر ڈرائیور سے بولے۔

"برٹش براڈکاسٹنگ ہاؤس چلو"

ڈرائیور ان کی طرف دیکھ کر لاپرواہی سے بولا۔

"مجھے افسوس ہے میں اس وقت یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ ٹھیک نصف گھنٹہ بعد مسٹر چرچل کی تقریر نشر ہوگی۔ جسے میں کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں اپنے وزیر اعظم کی تقریر ضرور سنوں گا۔"

چرچل نے یہ سنا تو بہت خوش ہوتے اور اسی خوشی کے عالم میں ڈرائیور کو ایک پونڈ انعام دے دیا۔

ڈرائیور نے بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بڑے شستہ لہجہ میں بولا۔

"آپ انتہائی اچھے اور نیک دل انسان ہیں چلیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں چرچل اور ان کی تقریر کو جہنم میں ڈالیے۔ وزیر اعظم کی تقریر تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ لیکن آپ سے نیک دل انسان کبھی کبھی ملتے ہیں۔"

ایک پاگل اور چرچل

وزیر اعظم انگلستان سر ونسٹن چرچل ایک بار پاگل خانہ کا معائنہ کر رہے تھے۔ انہوں نے گھوم پھر کر ساری جگہیں دیکھ لیں تو سوچا کہ پاگل خانہ کے کسی باسی سے بھی بات چیت کرنی چاہیئے۔ دفتر کے باہر ایک شخص کو کھڑے دیکھ کر چرچل نے اس سے پوچھا۔

"آپ کی تعریف؟"

وہ شخص بولا۔

"میں پاگل خانے میں زیر علاج تھا۔ اب صحت یاب ہو چکا ہوں اور آج ہی اپنے گھر لوٹ رہا ہوں۔"

یہ جواب دے کر اس شخص نے چرچل سے پوچھا۔

"آپ کی تعریف"

"میں برطانیہ کا وزیر اعظم ہوں!"

یہ سن کر وہ شخص ہنسا اور چرچل کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہمدردی بھرے انداز میں بولا۔

"بڑے میاں! فکر کرنے کی ضرورت نہیں آپ جلد ہی تندرست ہو جائیں گے۔ مجھے جن ایام میں پاگل خانہ لایا گیا تھا۔ میں ان ایام میں خود کو بادشاہ کہا کرتا تھا۔"

وہ میں ہوں

یہ قیام پاکستان سے قبل کا واقعہ ہے۔

گوجرانوالہ کے شاعر دیس راج یکتا ایڈووکیٹ نے مجید لاہوری، عدم، اختر شیرانی اور راقم الحروف کو دعوت پر مدعو کیا۔ میں اختر اور عدم لاہور سے گوجرانوالہ پہنچے اور مجید لاہوری پہلے سے گوجرانوالہ ہی میں مقیم تھے۔

نصف رات گزر چکی تھی، جب محفل کا اختتام ہوا۔ محفل اس مکان میں منعقد ہوئی تھی جو یکتا نے بطور خاص اس قسم کی محفلوں کے انعقاد کے لئے کرایہ پر رکھا تھا۔ یکتا صاحب تنہا جھومتے جھامتے گوجرانوالہ سٹیشن سے پار اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے اور ریلوے لائن پار کر گئے۔ ان کی کوٹھی سے دو سو قدم ادھر ایک کانسٹیبل نے ایک شخص کو جھومتے جھامتے سڑک پر چلے جاتا دیکھا تو روک کر پوچھا۔

"تمہارا نام؟"

"معلوم نہیں،" یکتا نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں اپنے نام کا بھی علم نہیں ہے؟" کانسٹیبل نے غصہ سے پوچھا

یکتا صاحب نے قدرے سوچ بچار کی پھر بولے۔

"تم ایسا کرو۔ فلاں سڑک کی فلاں نمبر کوٹھی پر جاؤ اور کوٹھی کے باہر نصب گھنٹی کو بجاؤ اور پوچھو کہ وکیل دیس راج یکتا گھر پہ ہے یا نہیں اگر یکتا گھر پہ نہ ہو تو سمجھ لینا کہ وہ میں ہوں اور میرا ہی نام دیس راج یکتا ہے۔"

کانسٹیبل کو اس شرابی وکیل کی منطق پر ہنسی آگئی اور وہ سہارا دے کر وکیل صاحب کو ان کی کوٹھی پر چھوڑ آیا۔

غلط فہمی

یہ ۱۹۸۰ء کے ماہ دسمبر کا واقعہ ہے۔

ماہانہ رسالے کا ایڈیٹر اپنے کمرہ میں بیٹھا ایک افسانہ کے مسودہ کو پڑھ رہا تھا کہ ایک اجنبی شاعر کمرہ میں داخل ہوا اور ایک نظم ایڈیٹر کی طرف بڑھا کر کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

ایڈیٹر نے نظم پڑھی اور ہر ہر بند پر داد دی۔ پھر اجنبی شاعر سے مخاطب ہوا۔

"تو کیا یہ نظم آپ کی اپنی نظم ہے؟"

"جی ہاں، یہ نظم میں نے خود لکھی ہے" شاعر نے کہا

یہ سن کر ایڈیٹر نے کہا۔

"تب تو اے حضرت اختر شیرانی! مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی میں گذشتہ اکتیس برس سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ آپ کی وفات حسرت آیات ہو چکی ہے"

ریہرسل

ایک مشہور فلمی مصنف نے اپنے ایک ہمسایہ سے اجو یں خود تھا پوچھا۔

"کیوں بھائی، کیا آپ نے میری نئی فلم دیکھی ہے جس میں میاں بیوی کی مسلسل لڑائی دکھائی گئی ہے؟"

"یعنی ہمسایہ بولا۔

"بھائی جی، میں نے آپ کی فلم تو نہیں دیکھی لیکن اس کی ریہرسل بار ہا آپ کے گھر تک ہوتے دیکھ چکا ہوں"

جیب کترے سے واقفیت

مراتب علی تائب کی جیب کٹ گئی اور میں اُن کے ساتھ گوالمنڈی پولیس سٹیشن پر پہنچا تو منشی پولیس نے رپورٹ لکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا تم اس آدمی سے واقف ہو جس نے تمہاری جیب کاٹی ہے؟"

مراتب علی تائب نے جو اپنے دور کے ایک پختہ مشق شاعر اور انتہائی شریف آدمی تھے بے ساختہ کہا۔

"جی ہاں، وہ یقیناً جیب تراش تھا"

آپ کی دُعا سے!

تکیہ کلام کا ذکر چل نکلا تو میری اہلیہ نے جو مختلف موضوعات پر دو سو سے زائد

. مضامین اور پچیس سے زیادہ طبع زاد افسانے لکھ چکی ہیں اور جو طبع بھی ہو چکے ہیں علاوہ ازیں جس کے ترجمے کئے ہوئے افسانے اور مضامین لاہور کے مشہور اخبار دل، روزنامہ امروز روزنامہ مساوات، ہفت روزہ آشیانہ اور دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہو چکے ہیں مجھے تکیہ کلام سے متعلق حسب ذیل لطیفہ سنایا۔

اختر بیگم نے کہا۔

"ایک خاتون کا تکیہ کلام آپ کی دُعا سے تھا۔ ایک روز اس کا شوہر وفات پا گیا تو اظہار افسوس کے لئے اس کے پاس عورتوں کا تانتا بندھ گیا۔ یہ دیکھ کر ایک نئی ہمسائی بھی اس کے پاس آئی اور بولی — "کیا آپ ہی کا شوہر مر گیا ہے؟"

بیوہ نے فوراً جواب دیا۔

"جی ہاں آپ کی دعا سے"

آنے کے دو اور جانے کے...؟

ہم پیسہ اخبار لاہور کے خاکسار ہوٹل سے چائے پی کر باہر نکلے تو چھوٹے پان والے کی دکان کے کونے پر مالٹے بیچنے والا باآواز بلند کہہ رہا تھا۔

"آنے کے دو آنے کے دو"

ریاض شاہد نے اس کے آگے سے گزرتے ہوتے پوچھا۔

"اور جانے کے کتنے؟"

منافقت

ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس میں جوش ملیح آبادی گوپی ناتھ امن اور دوسرے مشہور شعراء کے ساتھ غیر معروف نو مشق شعراء بھی پڑھ رہے تھے۔

ایک نو مشق شاعر کی باری آئی تو اس نے اپنا غیر موزوں کلام سنانا شروع کیا۔ جسے سن کر بیشتر شعراء نے آدابِ محفل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی۔ لیکن جوش ملیح آبادی خاموش نہ رہ سکے ایک ایک مصرع پر بڑھ چڑھ کر داد دینے لگے۔ جوش صاحب کے اس جوش و خروش کو دیکھ کر گوپی ناتھ امن خاموش نہ رہ سکے۔ بولے ـــــ

"حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"منافقت"

جوش صاحب نے فوراً جواب دیا۔

کیا بج رہا ہے؟

میں نے اپنے پوتے ندیم تسکین سے کہا۔

"بیٹے! دیکھو تو اس وقت کیا بج رہا ہے؟"

اس نے فی البدیہہ جواب دیا۔

"اباجی ریڈیو بج رہا ہے"

بہت اچھی بات سوجھی

اپنے دور کے سب سے بڑے اور کثیر الاشاعت اخبار "زمیندار" کے ایک سٹاف رپورٹر نے اپنے ایڈیٹر مولانا خدا بخش اظہر امرتسری سے کہا۔

"مولانا! بعض اوقات احمق لوگوں کو بھی بہت اچھی بات سوجھ جاتی ہے"

"ٹھیک ہے۔ اس وقت تمہیں بھی بہت اچھی بات سوجھی ہے"۔

جغرافیہ دان

شہداد پور (سندھ) کے مشہور شاعر حکیم و ڈاکٹر رحمان دانش اپنے ایک مہمان سے گفتگو میں مصروف تھے کہ مہمان بولا۔

"رحمان بھائی: میں متعدد بار دنیا کی سیر کر چکا ہوں"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جغرافیہ سے تو اچھی طرح واقف ہوں گے" رحمان دانش نے سوال کیا۔

جواب میں مہمان بولا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت زیادہ واقف نہیں ہوں، تاہم مجھے وہاں چھ سات روز قیام کا موقع مل گیا تھا۔ اور میں نے اسے بڑا خوبصورت شہر پایا تھا"۔

غلطیوں کی نشاندہی

دوست اور دوستی زیر بحث تھے۔ میں نے اپنے دوست اور راولپنڈی کے اچھے شاعر سلطان نصیب وانی سے کہا۔

"ایک بار ہم دو قلمکار دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کی غلطیوں کی نشاندہی کریں گے۔ اور ایسا کرنے سے ہماری دوستی مزید گہری بنیادوں پر استوار ہو جائے گی۔"

سلطان نصیب وانی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پھر اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟"

"یہ کہ آج چار برس گزر چکے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھی"

بے فکری کی تلقین

میرے ایام بچپن کا واقعہ ہے۔ میں اور ناول نگار ریاض جاوید (مرحوم) سکول سے ناغہ کر کے دریائے راوی پر (بارہ دری کے مقابل اس کنارے) نہانے کے لئے جایا کرتے تھے۔ ایک روز ہم اپنے کپڑے اتار لنگوٹے باندھ کر کھڑے تھے کہ ایک بوڑھا ملاح آگیا۔ ریاض جاوید نے ملاح کو مخاطب کیا۔

"چچا! سنا ہے بارہ دری کے آس پاس بہت بڑی بڑی مچھلیاں ہیں جو انسان کو ٹکریں مار مار کر جان سے مار دیتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم اس جگہ نہیں نہاتے میاں میر کی نہر پر چلے جاتے ہیں۔"

ملاح بولا ـــ "در واقعی چند روز پہلے تک یہاں کافی چھوٹی بڑی مچھلیاں تھیں جو جان لیوا ثابت ہو سکتی تھیں۔ لیکن اب آپ میاں بے فکر ہو کر نہائیں کیونکہ اس جگہ کی ساری چھوٹی بڑی مچھلیاں مگرمچھوں کے پیٹ کا ایندھن بن چکی ہیں"

فنی مہارت سے لاعلمی

یہ ۱۹۴۸ء کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے۔

ہم پانچوں ہر شام ناصر باغ (گول باغ) میں اکٹھے ہو کر گپ شپ میں مصروف رہا کرتے تھے۔ یہ گرمی کے ایام تھے۔ ہم پانچوں تقریباً پانچ بجے شام باغ میں پہنچ جاتے تھے۔ اور لگ بھگ تین گھنٹے ہنسی مذاق کی باتوں میں گزارتے تھے۔ ایک روز فیصلہ ہوا کہ ہر شخص ایک ایک لطیفہ سنائے۔

سب سے پہلے شبلی بی کام (شبلی ایم کام یا اے آر شبلی) جن کا اصل نام عبدالرحیم ہاشمی تھا، نے یہ لطیفہ بیان کیا۔

نئے نئے جوان پائلٹ کو علم تھا کہ ہوائی اڈے پر اس کی منگیتر بھی موجود ہوگی۔ وہ اپنی پہلی آزادانہ پرواز سے راولپنڈی سے لاہور آ رہا تھا اور اس کے سارے عزیز و اقارب اظہار مسرت میں اُسے مبارکباد کہنے کے لئے ہوائی اڈہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ نوجوان پائلٹ نے اپنی منگیتر کو متاثر کرنے کے لئے ہوائی اڈے پر اُترنے سے پہلے اپنے جہاز کو دو چار اعلیٰ قسم کی قلابازیاں کھلائیں اور اپنی پوری فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا۔ اس کا جہاز اڈے پر اترا تو وہ جہاز سے اُتر کر سینہ پھلائے اپنی منگیتر کے پاس آیا اس کی منگیتر نے اس کی فنی مہارت کو نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں جلد ہی کہیں جہاز کو سیدھا اڑنا بھی آ جائے گا۔"

لین دین

اکرام لودھیانوی نے اپنی باری آنے پر کہا:
"ایک آدمی نے ایک نہایت کنجوس آدمی سے کہا وہ شخص تو آپ کو مسلسل گالیاں دیئے جا رہا ہے۔ اور آپ ہیں کہ خاموش بیٹھے ہیں مجھے آپ کی اس خاموشی پر غصہ آ رہا ہے اور میرا خون کھول رہا ہے۔"
"عزیزم! تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ بھلے آدمی ذرا یہ تو سوچو کہ وہ شخص مجھے کچھ دے ہی رہا ہے مجھ سے کچھ لے تو نہیں رہا۔"

چور بازاری کی سزا

ظہور الحسن ڈار نے اپنی باری پر یہ لطیفہ بیان کیا:
"قصبے "چیچو کی ملیاں" اور قصبے "بھائی پھیرو" کے دو دوست مال روڈ لاہور کے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے گئے۔ جب وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو بیرے نے ایک پلیٹ میں رکھ کر چونتیس ۳۴ روپے کا بل پیش کیا۔
"چیچو کی ملیاں" کے دوست کو بڑا تاؤ آیا اس نے بل دیکھ کر با آواز بلند ہوٹل والوں کی چور بازاری کو کوسنا شروع کر دیا۔
"بھئی، ان چوروں کو بُرا بھلا کیوں کہہ رہے ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی چور بازاری کی انہیں پہلے ہی کافی سزا دے دی ہے۔ ان کے ایک درجن قیمتی چمچے

میری جیب میں آ چکے ہیں اب اسٹوبل ادا کرو اور ان چوروں کو ان کے حال پر چھوڑ دو،،

لڑکیاں رفوچکر ہو گئیں

سید عبدالحمید عدمؔ نے کہا۔

"یہ لطیفہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ایبٹ روڈ لاہور پر واقع شالیمار ٹاکیز کے مالک میرے دوست تھے، ایک روز تقریباً تین بجے دن میں ان سے ملاقات کے لئے سینما پہنچا تو دیکھا کہ سینما ہال میں بہت زیادہ تعداد میں خواتین موجود ہیں۔ یہ میٹنی شو کا وقت تھا۔ میں نے اپنے دوست مالک سینما (جو ایک ہندو تھا) سے پوچھا کہ کیا سینما کے ہر شو میں عورتیں اسی قدر زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں؟

"نہیں، ہر شو میں تو نہیں البتہ میٹنی شو میں خواتین کی خاصی تعداد ہوتی ہے کیونکہ یہ خواتین کالج گرلز ہیں جو کالج میں چھٹی کے بعد گھر کی بجائے سینما میں آگئی ہیں اور فلم دیکھ کر گھر لوٹیں گی،، مالک سینما نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید انکشاف کیا۔ "سینما ہال میں موجود زیادہ تعداد بلکہ شاید ساری کی ساری کالج گرلز کے ساتھ اُن کے بوائز فرینڈز ہیں،،

"کیوں خواہ مخواہ گپ ہانک رہے ہو" میں نے اعتراض کیا "چاہو تو ثبوت فراہم کر سکتا ہوں"، میرے دوست نے کہا۔

میں بولا۔ "بہتر ہے۔ لاؤ ثبوت۔ دیکھیں تمہارا قیافہ کہاں تک درست ہے"

میرا دوست مالک سینما شو شروع ہونے سے پہلے سینما کی سٹیج پر آیا اور با آواز بلند بولا۔

"مجھے ابھی ابھی متعلقہ پولیس اسٹیشن سے انچارج سب انسپکٹر پولیس نے خبردار کیا ہے کہ ایک معزز آدمی کی بیٹی اپنے کالج سے گھر نہیں پہنچی بلکہ مصدقہ اطلاع کے مطابق اپنے بجائے فرینڈ کے ساتھ شالیمار ٹاکیز میں آئی ہے۔ اس لئے اس کی دستیابی کیلئے پولیس دس منٹ بعد سینما ہال پہنچ رہی ہے"

مالک سینما قدرے توقف کے بعد بولا "میں اپنے سینما کی بدنامی نہیں چاہتا۔ اس لئے میں صرف پانچ منٹ کے لئے سینما ہال کی لائٹ بند کرا رہا ہوں وہ لڑکی اس تاریکی سے فائدہ اٹھائے اور فوراً ہال سے باہر چلی جائے تو اس کے لئے مناسب ہوگا۔"

پھر مالک سینما کے اشارے پر لائٹ بند کر دی گئی پھر پانچ منٹ بعد روشنی ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سینما ہال میں موجود ساری لڑکیاں رفوچکر ہو چکی ہیں اور اب سارے ہال میں مرد ہی مرد باقی رہ گئے ہیں۔

بچوں کو ڈرانے کے لئے

قیام پاکستان سے قبل لاہور میں ایک غیر معروف ہندو شاعر "تاجور سامری" نام کے تھے۔ ان کا ٹھگنا قد اور انتہائی ڈراونی صورت تھی میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ان پر انسان سے زیادہ کسی بھوت پریت کا گمان ہوتا تھا۔

ایک روز تاجور صاحب ڈی اے وی کالج میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں اپنی غزل سنا کر فارغ ہوئے تو دو لڑکیاں کیمرہ ہاتھ میں لئے ان کی طرف بڑھیں اور

قریب پہنچ کر فرمائش کی کہ وہ ان کی تصویر کھینچنی چاہتی ہیں۔
شاعر تاجور نے اٹھلا کر کہا۔
"آپ کو میرا فوٹو کیوں درکار ہے؟ کیا کریں گی آپ اس کا؟"
ایک لڑکی نے جواب میں کہا۔
"آپکا فوٹو بچوں کو ڈرانے کے لئے درکار ہے"
راقم الحروف کو یہ فخر حاصل ہے کہ اختر شیرانی مرحوم اس کے مخلص دوست تھے۔

اختر شیرانی اپنے دور کے سب سے بڑے رومانی شاعر تھے۔ ان کی شاعری سے قبل اردو شاعری کا محبوب مذکر تھا۔ میر مرحوم کا وہ شعر تو آپ کو یاد ہی ہوگا۔ جس کا ایک مصرعہ غالباً یہ ہے۔

اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں۔

اختر شیرانی مرحوم ہی اردو کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی محبوبہ سلمیٰ تخلیق کی اس طرح اردو شاعری کو نئی راہ پر لانے کا سہرا اختر شیرانی کے سر بندھتا ہے۔

خان کابلی لاؤ

مرحوم اختر شیرانی نہایت باوضع مرنجان مرنج خوش اخلاق اور بھولے بھالے انسان تھے۔ یہ قیام پاکستان سے قبل لاہور کے مشہور ہندو روزنامے پرتاپ کے دفتر کا واقعہ ہے۔ اختر شیرانی تیز تیز قدم ہی داخل ہوئے اور باآواز بلند حکم دیا

خان۔۔۔۔ کا۔۔۔۔ بلی۔۔۔ لاؤ

سب ایڈیٹروں میں سے بجز اختر مرحوم سے واقف تھے وہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ اختر صاحب دوبارہ باآواز بلند بولے۔

"بھئی کھڑے کیوں ہو رہے ہو۔ میں کہتا ہوں خان کابلی لاؤ"

سب ایڈیٹروں نے مارے حیرت کے ایک دوسرے کا منہ دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اختر صاحب کس خان کی بلی کو طلب کر رہے ہیں۔ راقم نے لطف اندوز ہوتے ہوئے سب ایڈیٹروں سے کہا۔ "بھئی تمہارے ادارے میں صحافی خان کابلی کام کرتے ہیں اور اختر صاحب انہی خان کابلی کو طلب کر رہے ہیں۔"

فوراً ہی خان کابلی کو دوسرے کمرے سے بلایا گیا اور سب ایڈیٹر صاحبان خان کابلی کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

خان کابلی قیام پاکستان کے بعد دہلی چلے گئے تھے جہاں وہ آج تک روزنامہ "پرتاپ" دہلی و جالندھر سے وابستہ ہیں اور اپنے صحافتی فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔

ہم سردار ہیں

انارکلی بازار کی نکڑ پر چوک لوہاری دروازہ میں سینکڑوں لوگ جمع تھے اور ان کے درمیان حضرت اختر شیرانی نے ایک شخص کے گریبان میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اور باآواز بلند کہہ رہے تھے۔

"تم جھوٹے ہو تم جعل ساز ہو، فریبی اور مکار ہو۔ تم سردار نہیں ہو۔ سردار

ہم ہیں - ہم ہی اصلی سردار. پٹھانوں کے نامور قبیلے شیرانی کے فرد بولے! اب کبھی خود کو سردار کہہ کے" اور وہ شخص اپنا گریبان چھڑاتے کے لئے جدوجہد کرتا ہوا بار بار کہہ رہا تھا۔

"میں سردار ہوں، میں اصلی سردار ہوں۔ میں کیسے مان لوں کہ میں سردار نہیں ہوں۔"

بات نے طول کھینچا تو بعض لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ تمہارے گریبان میں اُردو کے مشہور شاعر حضرت اختر شیرانی کا ہاتھ ہے جو اس وقت مخمور ہیں تم مان لو کہ تم سردار نہیں ہو اور اپنی راہ لو خواہ مخواہ جھگڑے میں اُلجھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس شخص نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔

"یار میں سکھ ہوں۔ اپنی سرداری سے منکر ہوا۔ تو میرا سکھی مت دسکھ مذہب) جاتا رہے گا۔ اور میں کسی صورت نہیں چاہتا کہ سکھ مت سے نکل جاؤں۔"

اتفاق سے سکھ سردار صاحب بھی بری طرح نشے میں بدمست تھے۔ آخر کار بڑی مشکل سے سکھ نے تسلیم کیا کہ بڑے سردار صاحب اختر شیرانی ہیں اور وہ چھوٹا سردار ہے۔ اس طرح یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ جو اختر شیرانی مرحوم ہر سکھ سردار کو دیکھ کر اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر تخلیق کو لیا کرتے تھے۔

کیسے معصوم تھے یہ لوگ اگلے وقتوں کے لوگ"

میں یہاں سے اپنے بیٹے نسیم تسکین کے لطائف درج کرتا ہوں جو روزنامہ صداقت میں شائع ہوئے تھے۔

زیب النساء کا ایک شعر اور دو پہلو

اورنگ زیب کی بیٹی شہزادی زیب النساء باغ میں ٹہل رہی تھی کہ اچانک

اس کی زبان سے ایک شعر ادا ہوا

چہار چیز زدل غم برد کلام چہار
شراب سبزہ و آب رواں و روئے نگار

" چار چیزیں دل کا غم دور کرتی ہے۔ شراب سبزہ رواں دواں پانی اور حسین و جمیل چہرہ "

اس دوران اچانک بادشاہ آگیا اور اس نے پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہی ہے۔ زیب النساء نے فی البدیع شعر کا دوسرا مصراع بدل کر شعر اس طرح پڑھا۔

چہار چیز زدل غم برد کرام چہار
نماز روزہ و تسبیح توبہ استغفار

چار چیزیں دل کا غم دور کرتی ہیں۔ نماز روزہ تسبیح توبہ استغفار اس طرح شعر مے خانے سے خانقاہ پہنچ گیا۔ اور بادشاہ بڑا خوش ہوا۔

شعر میں ذم کا پہلو

میر انیس نے لکھنؤ میں بر سر منبر مصرع پڑھا

" گنج علی کا گوہر یکتا حسین ہے "

لوگ مسکرانے لگے کیونکہ اردو میں گنجا اسے کہا جاتا ہے جس کے سر پہ بال نہ ہوں انہوں نے لوگوں کی مسکراہٹ سے محسوس کیا اور مصرع کو اس طرح بدلا۔

" بحر علی کا گوہر یکتا حسین ہے "

صوتی اعتبار سے لور بہرے میں یکسانیت ہے اور بہرا اسے کہتے ہیں جو کانوں

سے نہ سن سکے۔ لکھنوی نکتہ سنج ایک بار پھر مسکرائے تو اطہل نے دوبارہ غور و فکر کے بعد کہا۔

"کلن علی کا گوہر کتنا حسین ہے"

لوگ ایک بار پھر ہنسنے لگے کیونکہ اب شعر کے مطابق علی کو کانا بنا دیا تھا۔ آخرکار انہوں نے پوری سوچ بچار کے بعد پڑھا۔

"کنترِ علی کا گوہر کتنا حسین ہے"

اب مصرع میں ذم کا پہلو نہ تھا۔ اس لئے لوگوں نے داد دی۔

شاعری اور ڈپٹی کلکٹری

ناسخ کے شاگرد آغا کلب علی خاں نادر سرکاری ملازم تھے اور اپنی ملازمت کے دوران پھولے پھولے ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر بن گئے آپ نے ڈپٹی کلکٹر بننے کے بعد یہ شعر کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ فن شاعری منحوس ہے۔

شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا۔

اچھا شعر فیضان الٰہی ہے

مشہور شاعر ناسخ نے الہ آباد کے ایک مشاعرے میں ایک غزل پڑھی۔

دل اب محترم سا ہوا چاہتا ہے۔

یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے۔

عین اس موقع پر ایک لڑکا صف کے پیچھے سے برآمد ہوا لوگوں نے دیکھا۔

بھولی بھالی صورت انتہائی شرمیلا۔ مجمع عام میں غزل پڑھتے ہوئے شرماتے ہیں
لوگوں نے حوصلہ بڑھایا تو بڑی مشکل سے وہ سٹیج پر آیا اور مطلع پڑھا۔

دل اس بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

مطلع سنتے ہی مشاعرے میں دھوم مچ گئی۔ شیخ ناسخ بولے در بھائی یہ فیضان الٰہی ہے۔ اس میں استادی جوہر نہیں دکھا سکتی تمہارا مطلع مطلعِ آفتاب ہے"

فی البدیہہ

شاہی محل میں ایک کنیز آئینہ اٹھائے شہزادی زیب النساء کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کہ اچانک آئینہ ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ کنیز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

از قضا آئینہ چینی شکست
آئینہ قضائے الٰہی سے ٹوٹ گیا

زیب النساء نے یہ سنا تو فی البدیہہ دوسرا مصرعہ لگا کر پڑھا

خوب شد اسباب خود بینی شکست
(اچھا ہوا کہ خود بینی کا سامان ضائع ہو گیا)

آخرت میں ڈگری

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی بہن شدید علیل تھیں اس لئے غالب عیادت

کے لئے ان کے گھر گئے اور بولے "بوا کیا حال ہے؟"

بہن نے جواب دیا "بھیا! سخت پریشان ہوں، موت سر پر کھڑی ہے اور مجھے قرض کی فکر ہے جو اپنی گردن پر لئے جارہی ہوں۔"

مرزا غالب بولے "بہن تم خواہ مخواہ متفکر ہو کیونکہ اللہ میاں کے ہاں کوئی مفتی صدر الدین خاں نہیں ہے جو ڈگری کر کے پکڑوا لے گا۔

وبا اور ستر سالہ بوڑھا بوڑھیا

شہر دہلی میں سخت وبا پھیلی ہوئی تھی جب میر مہدی مجروح نے غالب کے نام اپنے ایک خط میں اس کا ذکر کیا تو غالب نے جواب میں لکھا۔

"بھئی یہ کیسی بے ضرر وبا ہے کہ ایک ستر سالہ بوڑھا اور ایک ستر سالہ بڑھیا غالب اور ان کی بیوی دونوں اس وبا کے ہاتھوں بالکل محفوظ ہیں اور یہ نگوڑی وبا ان دونوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی، تف ایسی وبا پر۔"

مغربی انداز جمہوریت

مغربی انداز جمہوریت کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے کہا۔

میں خلق کی حالت کو جانچوں تو توند کی بلندی کو دیکھا کر

یہ تو ہے پسند اپنی اپنی تو میں تول سے خوش تو ناپ سے خوش

حکیم الملت حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں

مردوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایک فقیر اور حاجی لق لق

یہ واقعہ اپنے دور کے نامور اخبار نویس ابو العلا حاجی لق لق کے ساتھ پیش آیا۔ حاجی لق لق عراق میں فوجی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ایک فوجی اخبار سے منسلک تھے اور ایک سات منزلہ بلڈنگ میں رہائش پذیر تھے۔ ایک روز انہوں نے نیچے جھانکا تو دیکھا کہ ایک شخص میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ہاتھ کے اشارے سے انہیں نیچے بلا رہا ہے۔ حاجی موصوف ساتویں منزل سے نیچے آئے تو اس عرب نے ان سے خیرات مانگی حاجی لق لق نے ہاتھ کے اشارے سے اس فقیر کو اپنے پیچھے آنے کے لئے کہا اور ساتویں منزل پر اپنے کمرے کے سامنے پہنچ کر بے ربط عربی زبان کے ایک جملے ہو کہا در بابا معاف کرو" اور فقیر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

صرف ایک کتا مانگا

مشہور شاعر ابو دلامہ نے ایک روز خلیفہ مہدی کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے ایک قصیدہ سنایا۔ مہدی قصیدہ سن کر خوش ہوا اور اسے کہا کہ اس کی جو بھی حاجت ہو بیان کرے۔ ابو دلامہ نے عرض کی کہ اے امیر المومنین مجھے ایک کتا عطا فرمانے کے احکامات جاری کئے جائیں۔ یہ سن کر مہدی کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے کہا کہ میں تو تجھے اپنی حاجت بیان کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں اور تو مجھ سے ایک کتا مانگ رہا ہے۔ ابو دلامہ نے بڑی دلجمعی سے کہا "اے امیر المومنین مجھے یہ بتایئے کہ حاجت میری ہے یا آپ کی؟" مہدی نے جواب میں کہا "تمہاری ہے" ابو دلامہ بولا "وربس تو میری

یہی استدعا ہے کہ مجھے ایک شکاری کتا دینے کے احکامات صادر فرمائے جائیں"
مہدی نے حکم دیا کہ اسے ایک کتا دے دیا جائے۔ ابودلامہ پھر گویا ہوا۔ "مدد اے
امیرالمومنین بھلا۔ جب میں شکار کے لئے روانہ ہوں گا تو کیا اس کتے کے ساتھ پیدل
دوڑا کروں گا" یہ سن کر مہدی نے یہ حکم دیا کہ اسے ایک گھوڑا بھی دیا جائے۔ جب
گھوڑا بھی مل گیا تو ابودلامہ پھر بولا۔ اے امیرالمومنین اس کا بھی تو اہتمام ہونا چاہیئے۔
کہ جب میں شکار لے کر گھر پہنچوں تو اسے پکانے والا بھی کوئی تو ہو۔ مہدی نے اس پر
ایک کنیز بھی بخش دی اب کی بار ابودلامہ بولا "اے امیرالمومنین آخر یہ کتا گھوڑا اور کنیز
رہیں گے کہاں؟" مہدی نے اسے ایک رہائشی مکان بھی عطا کر دیا۔ اس بار ابودلامہ
نے کہا۔ "اے امیرالمومنین اس طرح تو مجھ پر ایک پورے خاندان کا بوجھ آ پڑا ہے آخر
یہ سب کھائیں گے کہاں سے؟" مہدی نے کہا میں تمہیں ایک ہزار جریب خطۂ زمین
عامر (آباد سرسبز) اور ایک ہزار جریب غامر عطا کرتا ہوں۔ ابودلامہ بولا۔ حضور!
عامر کے معنی تو میں جانتا ہوں مگر غامر کیا ہے اس سے میں ناواقف ہوں۔ مہدی نے
کہا غامر اس خراب زمین کو کہتے ہیں جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ ابودلامہ یہ سن کر بولا۔ تو میں
امیرالمومنین کو ایک لاکھ جریب جنگل کی دیتا ہوں۔ لیکن میں تو امیرالمومنین سے صرف
دو ہزار جریب عامر کا طلبگار ہوں۔ مہدی نے پوچھا۔ لیکن کہاں سے؟ ابودلامہ
بولا۔ بیت المال سے۔ مہدی نے کہا۔ اچھا وہاں سے مال دوسری جگہ منتقل کر دو
اور ایک جریب اس کی دے دو۔ ابودلامہ نے کہا۔ اے امیرالمومنین جب وہاں
سے مال منتقل ہو گیا تو وہ غامر بن جائے گی۔ اس پر مہدی کی ہنسی نکل گئی اور انہوں نے
ابودلامہ کو عطیات سے خوش کر دیا۔

ابونواس کا دیوان

سلامی شاعر کا بیان ہے کہ اس نے عضد الدولہ کی خدمت میں پیش ہو کر اس کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا تو اسے بہت بڑا صلہ عطا ہوا قیمتی پارچات اور دینار ملے۔ عضد الدولہ کے سامنے شاہ فارس کی تلوار رکھی ہوئی تھی، عضد الدولہ نے دیکھا تو میں اس تلوار کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر عضد الدولہ نے تلوار میری طرف پھینک دی اور بولے کہ اسے لے لو۔ یہ سن کر میں نے کہا (دکل خیر عندنا من عندہٗ) جو خیر یعنی مال ہمارے پاس ہے وہ اس ہی کا عطیہ ہے تو عضد الدولہ نے غصہ میں بھر کر کہا کہ وہ تیرا باپ ہے۔

سلامی کا بیان ہے کہ میں یہ سن کر سخت حیران ہوا اور ان الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکا تو اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری کیفیت سنائی۔ میرے استاد نے سن کر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ تجھ سے بہت بڑی خطا سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ کلمات جو تیری زبان سے نکلے شاعر ابونواس کے ہیں جو اس نے ایک کتے کی تعریف میں کہے تھے۔ اس نے کہا تھا عربی اشعار کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

(کتے کو اس کے مالک نے تنگ کر کے سخت مصیبت میں ڈال رکھا ہے ان کی تمام کوششیں اس کی کوشش سے کامیاب ہوتی ہیں اور وہ جس خیر کے مالک ہیں وہ اسی کتے کا عطیہ ہے)

سلامی کا بیان ہے کہ اپنے استاد کے یہ الفاظ سن کر میں سخت متفکر ہوا اور واپس آکر ایک کپڑا اوڑھ کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

عضدالدولہ نے دریافت کیا کہ میں نے کپڑا کیوں اوڑھ رکھا ہے مجھے کیا ہوا ہے میں نے کہا کہ ابھی ابھی مجھے بخار چڑھ آیا ہے۔ انہوں نے بخار کا سبب پوچھا تو میں نے کہا کہ میں نے ابو نواس کا دیوان دیکھ لیا تھا۔ اس لئے بخار میں مبتلا ہوا ہوں عضدالدولہ نے سنا تو فرمایا۔ اس بخار سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ (مطلب یہ ہے کہ ہم معاف کرتے ہیں) یہ سن کر میں عضد[illegible] کے سامنے بھاگ کر دوڑ آیا۔

نون اور آفٹر نون

فیروز خان نون کی پہلی بیوی بیگم نون کے نام سے موسوم ہیں جب فیروز خان نون نے دوسری شادی کر لی تو ان کے ایک دیرینہ شناسا نے مولانا عبدالمجید سالک سے بطور مشورہ پوچھا۔ در مولانا" نون صاحب کی پہلی بیوی تو بیگم نون کہہ کر یاد کی جاتی ہیں۔ اب دوسری بیوی کو کیا کہا جائے گا۔؟

مولانا عبدالمجید سالک نے بے ساختہ کہا

آفٹر نون :۔ AFTER NOON

پُرخلوص فرمائش

یہ امرتسر کا واقعہ ہے۔ ایک مشاعرے میں جوش ملیح آبادی اپنے خالص پٹھانی انداز میں گرجتے برستے ہوئے رباعیاں پڑھ رہے تھے۔

انگور کی بیٹی کی چاہت کے باعث پڑھنے کے دوران بار بار ان کا منہ کف سے بھر جاتا اور وہ ہر بار ایک مکمل رباعی پڑھنے کے بعد ڈائس کے پیچھے منہ پھیر کر تھوک رہے تھے

چند رباعیاں پڑھنے کے بعد انہوں نے اگلے شاعر کے لئے جگہ خالی کی اور جونہی اناؤنسر نے دوسرے شاعر کا نام پکارنے کے لئے منہ کھولا مین اسی وقت سامعین میں سے ایک " فرمائشی آواز بلند ہوئی۔

" ابے پہلوان جی۔ ایک اور سنا دو ٹھوک کر"

اس پُرخلوص فرمائش کو سن کر جوش صاحب کی تو اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اور وہ سناٹے میں آ گئے۔ یکی سامعین کے مجمع میں سے کوئی بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ گویا ہنسی کا ایک سیلاب سا آ گیا۔ جس میں آخر کار جوش صاحب بھی شریک ہو گئے۔

نئی نظم اور دھوبی کا حساب

الٰہ آباد کے ایک کالج میں مشاعرہ زوروں پر تھا۔ جب اسرار الحق مجاز لڑکھڑاتے ہوئے ڈائس پر آئے تو سامعین کے مجمع میں سے آوازیں ابھریں۔

" آوارہ ، آوارہ "

سامعین کا اس سے مقصد یہ تھا کہ مجاز صاحب اپنی مشہور نظم آوارہ سنائیں آوارہ، آوارہ کے شور میں مجاز کی بھرائی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ جناب پہلے میری ایک نئی نظم سن لیں۔ بعد میں آوارہ بھی سنا دوں گا۔

مجمع میں خاموشی چھا گئی۔ اور سامعین مجاز کی نئی نظم سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ یہ دیکھ کر مجاز نے بھی جھوم جھوم کر پڑھنے کی ابتداء کی۔

" قمیص ایک، پاجامے دو، رومال ایک "

سامعین نے فلک شگاف قہقہے لگانے شروع کئے تو مجاز چونکے۔ پھر اپنے ہاتھ میں دبے کاغذ پر نظر ڈالی اور معصومیت سے بولے۔

"حضرات! معذرت خواہ ہوں۔ دراصل پرچے کے ایک طرف تو میری نئی نظم لکھی ہوئی ہے اور دوسری طرف دھوبی کا حساب درج ہے"

غزلوں میں بُو

مرزا محمد رفیع سودا نامور شاعر تھے۔ ان کے اساتذہ کرام میں سلیمان قلی خان ولد شاہ حاتم اور خان آرزو کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مرزا محمد رفیع سودا نہایت ظریف، حاضر دماغ اور موزوں طبع شاعر تھے۔ انہیں جس کسی پر غصہ آجاتا اور ہمیشہ ذرا ذرا سی بات پر آتا رہتا تھا وہ مشتعل ہو کر اس کی ہجو لکھنے لگتے تھے۔ وہ اپنے ملازم غنچے کو پکارتے۔ ابے او غنچے لانا تو ذرا میرا قلمدان غنچہ فوراً ان کا قلمدان پیش کرتا اور پھر فی البدیہہ ہجو لکھ دیتے۔

بادشاہ شاہ عالم نے جب سودا کی شاگردی اختیار کی تو ایک روز سودا سے پوچھ بیٹھے کہ وہ ایک روز میں کتنی غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ سودا نے جواب میں بتایا کہ وہ ایک دن میں دو چار شعر کہہ لیتے ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ عالم نے کہا۔

"ہم تو پاخانے میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں"

سودا نے جواب میں کہا۔

"حضور ان غزلوں میں بو بھی ویسی ہی ہوتی ہے"

یہ کہا اور سودا بادشاہ کے پاس سے چلے آئے اور بعد میں بادشاہ کے بار بار بلانے

پر بھی بادشاہ کی خدمت میں نہ گئے۔

کب تک

سودا کے کلام کی شہرت ہوئی تو لکھنو کے والی نواب شجاع الدولہ نے ان کے کلام کی شہرت سے متاثر ہوکر انہیں دعوت دی کہ وہ لکھنؤ تشریف لائیں۔ لیکن سودا نے دلی کی سکونت ترک کرنا منظور نہ کیا اور جواب میں حسب ذیل رباعی لکھ کر بھجوادی۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

شیر کا مالک

محمد حسین آزاد اپنی مشہور کتاب "آب حیات" میں ایک واقعہ لکھتے ہیں۔
آصف الدولہ ایک بار شکار کے لئے گئے تو خبر آئی کہ نواب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مار لیا ہے گو سودا کو نواب کی طرف سے ہمیشہ انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ مگر سودا کی رگ شعریت پھڑکی اور انہوں نے فوراً کہا

یارو یہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارہ!
شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب تک بھی یہ شعر پہنچ گیا۔ وہ شکار سے لوٹے تو سودا سے دوستانہ شکایت کی

"مرزا تم نے تو ہمیں بغیر خدا کا قاتل بنا دیا ہے"۔

سودا نے ہنس کر کہا۔ "جناب! شیر کا مالک تو اللہ ہی تھا۔ نہ حضور رکھتے اور نہ نذر دی"۔

درایں چہ شک

انشاء اللہ خاں نے اپنے عالم جوانی میں ایک مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی۔

"جھڑکی سہی، ادا سہی، چیں جبیں سہی
سب کچھ سہی پہ ایک نہیں کی نہیں سہی"

پھر انشاء نے جب یہ شعر پڑھا۔

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

سودا ضعیف العمر تھے اور مشاعرے میں موجود، آپ مسکرا کر بولے۔

"درایں چہ شک"۔

تلوک چند محروم کی محرومی

ایک دفعہ تلوک چند محروم ایک دعوت میں تاخیر سے پہنچے تو دیکھا کہ سارا کھانا ختم ہو چکا ہے اور لوگ کھانے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ تلوک چند محروم کو کھانے سے محروم دیکھ کر ایک شاعر دوست نے مشورہ دیا۔ "محروم بھائی اپنا تخلص تبدیل کر لیں تاکہ آئندہ بھی محروم نہ رہنا پڑے"۔

جگر مراد آبادی کے دستخط

جگر مراد آبادی کے ایک دوست نے اپنے ایک قانونی وثیقے پر ان سے بطور گواہ دستخط کرنے کے لئے کہا جگر صاحب نے سارا قانونی وثیقہ پڑھا اور اس میں دو غیر شاعرانہ الفاظ نکلانے پر اصرار کیا۔ اور پھر اس وقت اس قانونی وثیقے پر دستخط کئے۔ جب وہ دونوں غیر شاعرانہ الفاظ نکال دیئے گئے۔

قاآنی کی سچی بات

قاآنی نے شاہزادہ فریدون مرزا کے حضور قصیدہ پیش کیا تو شاہزادہ نے خوش ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں تمہیں اپنا درباری مؤرخ مقرر کر دوں"

قاآنی نے یہ سنا تو بولا "حضور سچی بات یہ ہے کہ میں درباری قصیدہ نگار ہی اچھا ہوں کیونکہ میں شاعر ہوں اور شاعر سچ کہنا نہیں جانتے۔

صحت کا راز

وہ قیام پاکستان سے قبل ہندو مالکان اخبارات کے روزناموں میں بحیثیت۔ جائنٹ ایڈیٹر، کالم نویس اور شاعر کام کرتے رہے ہیں آج بھی ان کا شمار اچھے شاعر اور ذہن کالم نویسوں میں ہوتا ہے گو ان کی عمر لگ بھگ اسی برس ہے۔ لیکن ان کی صحت اور چستی دیکھ کر ان پر کسی جوان کا گمان ہوتا ہے۔ ایک پریس رپورٹر ان کی خدمت میں حاضر

ہوتا ہے اور سوال کرتا ہے ۔

"محترم بزرگ صحافی صاحب آپ کی صحت اور چستی کا راز کیا ہے؟"

بزرگ صحافی۔ "کھلی ہوا"

پریس رپورٹر۔ "اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

بزرگ صحافی۔ "شادی کے بعد میری اور بیوی کی پہلی جھڑپ ہوئی تھی تو ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا تو جس کی غلطی ہوئی وہ باہر چلا جائے گا"

پریس رپورٹر۔ "لیکن اس سے آپ کی صحت کا کیا تعلق ہے؟"

بزرگ صحافی۔ "بس اس کے بعد مجھے گھر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ میں بیوی بچوں سے آزاد ہمیشہ کھلی فضاؤں میں گھومتا رہا۔"

آخری نظم

ایک شاعر صاحب دفتر ماہنامہ "افکار" کراچی میں ہر ماہ اپنی دو چار نظمیں اشاعت کے لئے دے جاتے تھے۔ "افکار" ایک نہایت معیاری ادبی رسالہ ہے اس کے مدیر حضرت صہبا لکھنوی خود ایک بلند پایہ شاعر ہیں وہ ہمیشہ سے "افکار" میں نہایت اونچے معیار کی نظمیں شائع کرنے کے عادی ہیں اس مبتدی شاعر کی کوئی بھی نظم اس قابل نہ ہوتی تھی کہ گوارا ہی کی جاسکے اور اشاعت کے قابل ہو۔

صہبا بھائی نے واضح الفاظ میں تو اس شاعر کی حوصلہ شکنی نہ کی لیکن ساتھ ہی اس کی حوصلہ افزائی بھی کبھی نہ کی۔ ایک روز وہ شاعر جب آئے اور بے چینی سے پوچھا "میری آخری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے"؟

"یہ جان کر وہ آپ کی آخری نظم ہے میں اسے بہت غور سے پڑھوں گا" حضرت صہبا لکھنوی نے جواب دیا۔

یادداشت

حضرت مجبو لاہوری نے اپنی انگلی میں دھاگہ باندھ رکھا تھا۔ ان کے ایک دوست نے پوچھا۔ "آپ نے انگلی میں دھاگہ کیوں باندھ رکھا ہے"؟

"میری بیوی نے باندھا تھا تاکہ اسے دیکھ کر مجھے خط ڈالنے کی یاد آجائے۔"

"تو آپ نے خط ڈال دیا"

"نہیں جی، میری بیوی مجھے خط دینا بھول گئی"

دوست

"کیا ایڈیٹر صاحب اندر ہیں؟"

"جی ہاں وہ کام میں لگے ہوئے ہیں" چپڑاسی نے جواب دیا۔ "ان سے کہو کہ ان کے ایک دوست ملنا چاہتے ہیں"

"کیا آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں؟"

"ہاں"

"بہت اچھا، میں انہیں بتائے دیتا ہوں،، ان کا کہنا ہے کہ اس شہر میں اُن کا کوئی دوست نہیں ہے۔"

شوخیٔ تحریر

ایک مشاعرہ میں اسرار الحق مجاز (مرحوم) بڑی محویت کے عالم میں اپنی غزل سنانے میں مصروف تھے تو اچانک ہی سامعین میں سے ایک خاتون کی گود میں شیر خوار بچہ بڑے زور زور سے رونے اور چلانے لگ گیا۔

مجاز نے اپنی غزل کا شعر ادھورا چھوڑا اور کسی ماہر اداکار کی طرح حیران و پریشان ہو کر بلند آواز سے پوچھنے لگے۔

ع نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا۔

بگڑتے دیر نہیں لگتی

اسرار الحق مجاز اپنی زندگی کے آخری عرصہ میں نیم دیوانگی کی کیفیت کے عالم میں رہنے لگے تھے وہ ایک بار نیم دیوانگی کی کیفیت میں کسی مجلس وعظ میں جا پہنچے تو ان کے ایک آشنا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"حضرت! آپ اور اس محفل میں"

"جی ہاں، جی ہاں" مجاز نے بڑی سنجیدگی سے جواب میں کہا۔
"بھائی! آدمی کو بگڑتے کوئی دیر نہیں لگتی۔"

ویل پلیڈ مسٹر

ایک مشاعرہ میں ایک نوجوان شاعر نے اپنی ایک غزل پڑھی جس کی زمین تھی

نظاروں سے کھیلا، بہاروں سے کھیلا

شاعر نے غزل ختم کی تو مجاز نے بآواز بلند کہا۔

"ویل پلیڈ مسٹر" "WELL PLAYED MR"

عقل اور شاعری

مجاز کو ان کے پاگل پن کے تحت رانچی کے "شفاخانۂ دماغی" میں داخل کر دیا گیا جہاں سے وہ چند ماہ بعد لوٹے تو ان کے ایک شناسا نے دریافت کیا۔

"مجاز صاحب کیا واقعی آپ کی عقل نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔"

مجاز نے ایک سرد آہ بھری اور بولے

"بھائی عقل میرے پاس تھی ہی کہاں جو میرا ساتھ چھوڑ دیتی عقل ہوتی تو بھلا میں اس ملک میں شاعری کرتا؟"

نکتہ سنج شاعر اور اُستادفن

لگ بھگ ساڑھے چار ہزار سال قبل کا واقعہ ہے کہ یونان کے شاہی دربار میں بادشاہ نے دربار سے متعلق دو شاعروں سے پوچھا کہ ان میں بڑا شاعر کون ہے؟ ان شاعروں میں ایک تو نکتہ سنج شاعر تھا اور دوسرا استادفن تھا۔ استادفن نے بادشاہ کے سوال کا جواب دیا۔

"جناب عالی! اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ گذشتہ سال کے دوران میرے ۴ دیوان شائع ہوئے جبکہ ہومر نے صرف دو تین نظمیں لکھیں۔ اس صورت حال میں کسی

شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ میں ہومر سے کہیں بڑا شاعر ہوں۔"

یہ سن کر بادشاہ نے ہومر کی طرف دیکھا اور کہا "تم کیا کہتے ہو؟"

ہومر بولا۔ "در حضور ایک بار انطاکیہ کے جنگلوں میں ایک سورنی نے ایک شیرنی سے کہا تھا کہ وہ جنگل کی ملکہ ہوتے ہوئے سال میں صرف ایک بچہ جنتی ہے جبکہ وہ بفضلِ تعالیٰ اتنے بچے جنتی ہے کہ اس کے گھر کا وسیع دالان بھر جاتا ہے اس کے جواب میں شیرنی نے کہا تھا۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میرا ایک ہی بچہ شیر ہوتا ہے جبکہ تمہارے سارے بچے سور کے بچے ہوتے ہیں"

انکساری

آغا حشر کاشمیری مرحوم کے شناساؤں میں ایک ایسے مولوی صاحب بھی تھے جن کی فارسی دانی کو ایرانی بھی تسلیم کرتے تھے لیکن یہ اتفاق تھا کہ مولوی صاحب بیکاری کے ہاتھوں سخت پریشان تھے۔ اچانک ایک روز آغا حشر کاشمیری کو پتہ چلا کہ ایک انگریز افسر کو فارسی سیکھنے کے لئے اتالیق درکار ہے۔ آغا صاحب نے بمبئی کے ایک معروف رئیس کے توسط سے مولوی صاحب کو اس انگریز کے ہاں بھجوا دیا۔ صاحب بہادر نے مولوی صاحب سے کہا۔

"ویل مولوی صاحب ہم کو پتہ چلا کہ آپ بہت اچھا فارسی جانتا ہے؟"

مولوی صاحب نے انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "در حضور کی بندہ پروری ہے ورنہ میں فارسی سے کہاں واقف ہوں۔"

صاحب بہادر نے یہ سنا تو مولوی صاحب کو تو خوش اخلاقی سے پیش آتے

ہوئے رخصت کر دیا۔ لیکن اس رئیس سے یہ شکایت کی کہ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر ایک ایسے آدمی کو فارسی پڑھانے کے لئے بھیج دیا جو فارسی کا ایک لفظ تک نہیں جانتا تھا

بور آدمی اور برنارڈ شا

جارج برنارڈ شا ایک پارٹی میں شریک تھے اور بری طرح بور ہو رہے تھے۔ کیونکہ ایک شخص خود کو نمایاں کرنے اور شا سے تعلقات قائم کرنے کے لئے ان سے خواہ مخواہ غلط ملط گفتگو کرنے میں مصروف تھا۔ برنارڈ شا جلد ہی اس شخص سے اکتا گئے اور بولے۔

مسٹر کیا آپ کو علم ہے کہ آپ بہت وسیع معلومات کے مالک ہیں۔ بہت سی باتوں سے واقف ہیں۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ آپ کو اپنے بارے میں ایک بات کا علم بالکل نہیں ہے۔"

"وہ کیا"، اس شخص نے بڑی دلچسپی سے استفسار کیا۔

"وہ بات یہ ہے کہ آپ ایک بہت ہی بور آدمی ہیں"، برنارڈ شا نے کہا "اور یہ بات میں بخوبی جانتا ہوں۔"

ہندو اور انگریز

حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اور اسکا کھلم کھلا اظہار بھی فرماتے رہتے تھے ایک بار کسی محفل میں ایک صاحب نے کہا کہ انگریز ہندو سے بہتر ہے۔ آپ نے یہ سن کر بے ساختہ فرمایا

"ہمیں یوں کہنا چاہیئے کہ ہندوانگریز سے بھی بدتر ہے۔"

صحیح رائے

سر والڈ ہانٹیس پیج ایک مشہور رسالے پنچ کے ایڈیٹر تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک نوآموز افسانہ نگار لڑکی نے انہیں ایک خط لکھا جس میں درج تھا کہ "جناب عالی! آپ نے گذشتہ دنوں میری ایک کہانی مجھے لوٹا دی ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ نے میری کہانی پڑھے بغیر مجھے لوٹا دی ہے۔ کیوں میں نے بطور آزمائش اپنی کہانی کے کئی صفحات کو گوند سے جوڑ دیا تھا یہ سارے صفحے ویسے ہی جڑے کے جڑے واپس آگئے ہیں۔ اب میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو چکی ہوں کہ آپ نے افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھے بغیر لوٹا دیتے ہیں"

مسٹر پیج نے چند سطور میں جواب دیا۔

"محترمہ! مجھے ناشتے میں انڈے کھانے کی عادت ہے۔ انڈا توڑتے ہی مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے یا گندا ہے۔ یقین کیجئے میں نے زندگی بھر کبھی پورا انڈا کھانے کے بعد رائے قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

آیا ہے اور گا ہے

ایک روز میر سوز نے مرزا سودا کے گھر پہنچ کر انہیں اپنا ایک مطلع سنایا۔

نہیں نکلے ہے میرے دل کی آیا ہے گا ہے۔
اے فلک بہر خدا رخصت آہے گا ہے'

مرزا سودا نے یہ سن کر کہا "صاحب بچپن میں اپنے ہاں پشتو کی ڈومنیوں سے یہ لفظ اپلا ہے سنا تھا یا پھر آج آپ کی زبانی سنا ہے۔ اس کے بعد مرزا سودا نے خود اسی وقت مطلع کہہ کر یہ پڑھا۔

نہیں جوں گل ہوس ابر سیاہ ہے گاہے!
کا آہوں خشک میں لے برق نگاہ ہے گاہے

ان دنوں میاں جرأت کی شاعری کا آغاز تھا انہوں نے مطلع پڑھا۔

سرسری ان سے ملاقات سے گاہے گاہے
صحبت غیر میں کاہے مرراہے گاہے۔

ایک اور مطلع ہے پتہ نہیں کس کا ہے ذوق کا ہے یا بہادر شاہ ظفر کا سنیے

اس طرف بھی تمہیں لازم ہے نگاہے گاہے
دم بدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

ذوق سودائی ہیں

ایک محفل میں لوگ میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے اس محفل میں مرزا غالب بھی موجود تھے۔ اچانک شیخ ابراہیم ذوق بھی آ گئے اور بحث میں حصہ لیتے ہوئے سودا کو میر تقی میر پر ترجیح دینے لگے۔ غالب نے ذوق کو دیکھا کہ میر تقی میر پر مرزا سودا کو ترجیح دے رہے تھے۔ تو بے ساختہ بولے "میرا تو خیال تھا کہ آپ میری ہیں لیکن اب پتہ چلا کہ آپ سودائی ہیں"۔

فکر اور بیوی بچے

سردی کے ایام تھے پنجرہ سامنے دھرا تھا اور مرزا غالب دیکھ رہے کہ طوطا پنجرے میں مارے سردی کے پروں میں منہ چھپاتے بیٹھا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر مرزا غالب بولے "میاں مٹھو جی تعجب ہے تمہارے نہ تو بچے ہیں اور نہ بیوی پھر تم کس فکر میں سر جھکائے بیٹھے ہو۔؟

رتھ مونث یا مذکر

دہلی والوں میں سے رتھ کو بعض نے مذکر بولا اور باندھا ہے اور بعض مونث لکھتے اور پڑھتے لیتے ہیں کسی نے مرزا غالب سے استفسار کیا۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے رتھ مذکر ہے یا مونث ؟ مرزا غالب بولے بھائی جب اس میں عورتیں بیٹھی ہوئی ہوں تو اسے مونث سمجھنا چاہیئے۔ اور جب اس میں مرد بیٹھے ہوں تو اسے مذکر سمجھا جائے۔

سنگت ہو تو ایسی

برصغیر پاک و ہند کے نامور شاعر اسرار الحق مجاز اور جلال ملیح آبادی لکھنو کے ایک شراب خانے میں داخل ہو رہے تھے۔ تو اچانک دونوں نے گھوم کر دیکھا ان کا مشترکہ دوست جو بڑا پرہیز گار اور نماز روزے کا پابند تھا ان کے عقب میں شراب خانے سے چند قدم دور گزر رہا تھا۔

نیاز نے قدرے شرم محسوس کرتے ہوئے گھوم کر اپنے اس دوست سے کہا "بھئی کمال ہے تم دن میں متعدد بار مسجد جاتے ہو۔ لیکن میں نے کبھی ایک بار بھی تمہارا پیچھا نہیں کیا۔ مگر ایک تم ہو کہ شراب خانے تک میں میرا ساتھ نہیں چھوڑتے واقعی ٹھیک کہا ہے کسی نے سنگت ہو تو ایسی ہو"

موم کی پتلیاں اور چمن ہند کی پریاں

سید اکبر حسین اکبرالہ آبادی کے فرزند سید عشرت حسین انگلستان گئے اور وہاں جا کر بمشکل اپنی خیریت کا خط لکھا تو اکبر الہ آبادی نے بیٹے کو دو شعر لکھ کر بھیج دیئے۔

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت آئی
چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

فکر سخن اور آگ

ایک روز شیخ ناسخ لکھنوی اپنے خانہ باغ کے بنگلے میں بیٹھے فکر سخن میں محو تھے کہ ایک ملاقاتی آگیا۔ ناسخ نے بے دلی سے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ تاکہ وہ صاحب چلے جائیں اور ان کی فکر سخن میں حارج نہ ہوں لیکن ملاقاتی نہ ٹلے آخر کار ناسخ خود کسی بہانے سے اٹھے اور گھر میں چلے گئے لیکن اس پر بھی ملاقاتی نہ سمجھ سکے اور ڈٹے رہے مجبور

بولو نا سنگھ نے چلم میں سے ایک چنگاری اٹھا کر بنگلے کی ٹٹی میں رکھ دی ٹٹی جلنے لگی اور ملاقاتی صاحب گھبرا کر اٹھے تو نا سنگھ مضبوطی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولے ۔

"بھئی اب جاتے کہاں ہو اب تو تمہیں میرے ساتھ ہی جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہونا پڑے گا ۔ تم میرے فکر سخن کو خاک میں ملا کر میرے دل کو جلا چکے ہو اب میں نہیں جانے نہ دوں گا ۔"

ممی کا اعتراف

یہ واقعہ پشاور کے صحافی پرویز اقبال نے اپنے ایک دوست کو سنایا تھا

ماہرین آثار قدیمہ کی ایک جماعت کو مصر سے ایک ممی موصول ہوئی کہ اس کی عمر کا تخمینہ لگا کر بتایا جائے کہ یہ کس فرعون کے عہد کی ہے ماہرین سر جوڑ کر بیٹھے اور بھر پور معائنہ کے بعد بھی نہ بتا سکے کہ اس ممی کی عمر کیا ہے ماہرین کے اعتراف ناکامی کے بعد ارباب اقتدار نے پولیس کی مدد حاصل کی کہ وہ اس معاملہ میں بھی اُن کی مدد کرے پولیس ہر معاملہ میں ارباب اقتدار کی مدد کیا کرتی تھی ۔ اور اسے ارباب اقتدار کے دست و بازو کی حیثیت حاصل تھی پولیس والوں نے ممی کے ساتھ چار گھنٹے ایک کمرے میں گزارے اور مصروف عمل رہے ۔ پھر کمرے سے باہر نکل کر ایک بڑے پولیس افسر نے اعلان کیا کہ اس ممی کی عمر چار ہزار دو سو اکتیس برس ہے ۔

سارے ماہرین سخت متعجب ہوئے اور انہوں نے ڈرتے ڈرتے اس پولیس افسر سے دریافت کیا

"آپ کو ممی کی عمر کا کیسے پتہ چلا ہے؟"

"وہ بھی یہ بھی کوئی مشکل کام تھا" پولیس افسر نے جواب دیا۔ "وہ ممی ہمارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس کی عمر چار ہزار دو سو تین برس ہے"

اپنی بات منوانے کیلئے

اس واقعہ کے راوی شہداد پور کے صحافی محمد ظفر لودھی ہیں

قتل کا مقدمہ بڑی حد تک خراب ہو چکا تھا آخر کار ملزم کا وکیل اس نتیجے پر پہنچا کہ جیوری کے کسی رکن کو رشوت دینا ضروری ہے اس نے کوشش کی اور ایک رکن کو رضامند کر لیا کہ اگر وہ ملزم کو سزائے موت کی جگہ جیوری سے عمر قید کی سزا کا فیصلہ صادر کرا دے گا تو اُسے نقد دس ہزار روپے مل جائیں گے۔ رکن نے دس ہزار روپے کے لالچ میں حامی بھر لی۔ فیصلہ کے دن جیوری کے ارکان سارا دن بحث میں مصروف رہے اور شام کے وقت انہوں نے ملزم کی عمر قید کا فیصلہ سنا دیا۔ فیصلہ کے بعد وکیل نے اس رکن کو دس ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔

"فیصلہ میں اتنی دیر کیوں لگی؟"

رکن نے کہا "بھائی جان! دوسروں کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرنا آسان تو نہیں ہے جیوری کے سارے ارکان تو اسے بری کرنے پر اصرار کر رہے تھے، لیکن میں بضد تھا کہ اسے عمر قید کی سزا دی جائے مجھے اپنی بات منوانے کے لئے بڑی محنت کرنی پڑی۔"

جوش ملیح آبادی اور مولانا

ایک دفعہ جوش ملیح آبادی، مولانا ابو الکلام آزاد سے ملاقات کے لئے گئے اور

ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر اپنے نام کا کارڈ اندر بھجوایا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بعض ضروری معاملات پر غور وفکر میں مصروف تھے اس لئے جوش ملیح آبادی کا کارڈ نہ دیکھ سکے۔ ادھر جوش صاحب نے انتظار کی طوالت سے گھبرا کر یہ شعر لکھ کر اندر بھیجا اور خود فوراً ہی وہاں سے چلے آئے۔ شعر یہ تھا۔

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی وقت مولانا'

عدم وجود

پنڈت ہری چند اختر اور عبدالحمید عدم سالہا سال کے بعد ایک مشاعرے میں اکٹھے ہوئے تو اختر صاحب عدم صاحب کو پہچان نہ سکے کیونکہ عدم صاحب بہت موٹے ہو چکے تھے عدم صاحب یہ جان کر کہ اختر صاحب انہیں پہچان نہیں سکے ان سے مخاطب ہو کر بولے۔،

"پنڈت جی، مجھے پہچانا میں ہوں عدم"

" پنڈت ہری چند اختر کے منہ سے بے ساختہ نکلا

" اگر تم عدم ہو تو وجود کیا ہوگا۔"

بیوی کی اہمیت

ہم چاروں نے فیصلہ کیا کہ ایک ایک لطیفہ سنایا جائے۔ سب سے پہلے میری باری آئی۔ میں بولا۔

ایک اخبار نویس شہر کی نامور مسرور ترین شادی شدہ خاتون سے " کامیاب شادی " کے موضوع پر انٹرویو لے رہا تھا خاتون نے کہا

" دراصل میری کامیاب ازدواجی زندگی کا راز یہ ہے کہ میرے شوہر سیاہ وسفید کے مالک ہیں اور میں ان کے ہر فیصلے پر سر جھکا دیتی ہوں ."

" اچھا تو یہ بات ہے " اخبار نویس نے کہا

" لیکن یہ بھی فرمایئے کہ آپ کے شوہر سیاہ وسفید کے مالک کس کے فیصلہ سے بنے ہیں "

" آپ اخبار نویس ہو کر اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے کہ میرے سوا کسی میں یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ میرے شوہر کو سیاہ وسفید کا مالک بنائے ."

خاتون نے اخبار نویس کو جواب دیا ."

یہ لطیفہ ریاض شاہد نے سنایا .

سچی بات

ایک خاتون نے ایک فقیر کی ہتھیلی پر پانچ پیسے کا سکہ رکھتے ہوئے کہا

" بڑے میاں ! یہ لو . اور میری صحت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے رہو ."

" قابلِ احترام خاتون ! سچی بات یہ ہے کہ آپ کے چہرے کی زردی سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ پانچ پیسے کی دعا آپ کی صحت کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو سکتی . "

اکرام لدھیانوی نے اپنی باری پر حسب ذیل لطیفہ سُنایا۔

امریکی امداد کے بغیر

ایک امریکی خاتون جو سیاح تھی، کلکتہ، بمبئی اور دہلی ہوتی ہوئی آگرہ پہنچی اور تاج محل دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر اس نے تاج محل کے حسن اور نفاست کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے اور آخر میں عجائبات عالم میں شمار اس عمارت کی جی بھر کر تعریف کرنے کے بعد بولی۔

"میں سخت حیران ہوں کہ بادشاہ شاہ جہان امریکی امداد کے بغیر اس قدر حسین و جمیل عمارت بنانے میں کیسے کامیاب ہو گیا۔"

حسب ذیل لطیفہ شہداد پور کے مشہور شاعر حکیم ڈاکٹر رحمان دانش صاحب نے سنایا تھا جو ان دنوں لاہور میں ہمارے یہاں مہمان تھے۔

قسمت آزمائی کا موقع

بیوی شوہر سے دھوکہ صرف اس وقت کھاتی ہے جب اس کا شوہر اس کے اندازے اور امید کے خلاف طرز عمل اپنائے۔

عدالت میں جج نے ملزم شوہر سے استفسار کیا۔ "تمہیں اپنی بیوی کی پٹائی کرنے کی تحریک کیسے ہوئی۔" ملزم شوہر جواب میں بولا۔

"محترم جناب! اس وقت وہ میری طرف پشت کئے کھڑی تھی۔ میں جھاڑو دے رہا تھا، میں نے کمرے کی صفائی کر رہا تھا اور عقبی دروازہ بالکل کھلا ہوا تھا جس سے میں

بخوبی فرار ہو سکتا تھا۔ اس لئے میرے دل میں آئی کہ یہ موقع قسمت آزمائی کے لئے انتہائی مناسب ہے۔"

رخسار کا تل اور سمرقند و بخارا

امیر تیمور ایران کے مختلف شہر فتح کرتا ہوا شیراز پہنچا تو مشہور شاعر حافظ شیرازی کو طلب کر کے بولا "کیا یہ شعر تمہارا ہے؟"

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را!

"اگر شیراز کا وہ حسین و جمیل لڑکا میرے دل کو ہاتھ میں لے لے تو میں اس کے رخسار کے تل پر سمرقند و بخارا کو قربان کر دوں"

حافظ شیرازی نے جواب دیا "امیروں کے امیر، بجا فرما رہے ہیں یہ شعر میں نے ہی لکھا ہے۔"

یہ سن کر تیمور غصہ سے بولا۔ "بھئی میں نے تو سمرقند کی تعمیر و آرائش میں دنیا بھر سے لایا ہوا ساز و سامان اور بڑی دولت صرف کی ہے اور تم ایک معمولی سے شاعر ہوتے ہوئے اسے محبوب کے ایک خال پر نچھاور کر رہے ہو۔

حافظ شیرازی نے اس کے جواب میں کہا "حضور یہ اسی فیاضی کا نتیجہ ہے۔ کہ آپ مجھے اس مفلسی و ناداری کے عالم میں دیکھ رہے ہیں"

امیر تیمور کو حافظ شیرازی کا یہ جواب بہت پسند آیا۔ اور اس نے خوش ہو کر حافظ شیرازی کو مالامال کر دیا

نام کا سجع

نام کا سجع ہو جانا سے مراد ہے۔ نام کا خوش اسلوبی سے کسی مصرع یا شعر میں منزول ہونا محمد کالے نامی کی خواہش تھی کہ اس کے نام کا سجع ہو جاتا۔ لیکن اس سلسلے میں سجع کرنے والے مختلف شعراء کی دقت یہ تھی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گورے تھے کالے نہ تھے۔ ایک اچھے شاعر نے اس مسئلے کو یوں حل کیا۔ کہا۔

ہر دم نام محمد کالے۔

جوتا پڑے گا۔ جوتا کھایئے

لکھنؤ کا واقعہ ہے احمق پھپوندی ایک بوٹ ہاؤس پر جوتا خریدنے گئے اور دکاندار سے ایک جوتے کی قیمت دریافت کی۔ دکاندار نے انہیں گنوار سمجھ کر کہا—
"آٹھ آنے جوتا پڑے گا"۔

گاہک نے بے ساختہ جواب دیا۔ "بہت گراں قیمت ہے۔ مناسب آدھ آنہ جوتا کھایئے"

یہ کہہ کر گاہک فی الفور اپنی راہ ہو لیا۔

ایک نہیں رکھا۔

ماہ رمضان اختتام پذیر ہوا۔ تو مرزا غالب قلعہ معلی پہنچے۔ اور بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر نے ان سے استفسار کیا۔ "مرزا اس بار کتنے

روزے رکھے ہیں۔"

غالب نے جواب دیا ـــــ "پر دمرشد ایک نہیں رکھا"

اس فقرے کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ صرف ایک روزہ نہیں رکھا دوسرے یہ کہ ایک روزہ بھی نہیں رکھا۔

میرے بیٹے نسیم تسکین کے تحریر کردہ لطائف ختم ہوتے اب میرا اہلیہ اختر بیگم کے چند طبع شدہ لطائف ملاحظہ ہوں

نیم پاگل

مفتی انعام اللہ شہابی ہمیشہ معمولی سے کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے۔ اور بیشتر اوقات اپنے خیالات میں گم رہا کرتے تھے۔ مرحوم ایک بار ایک ہوٹل میں چائے پینے میں مصروف تھے۔ اور ان کی میز پر دو لڑکے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مفتی صاحب کو پان سگریٹ کی لگن ایک پنواڑی کی دوکان پر لے گئی تو ایک لڑکے نے دوسرے سے استفسار کیا۔ "یہ صاحب کون ہیں"؟

دوسرے نے جواب دیا "یہ مجھے تو کوئی نیم پاگل معلوم ہوتا ہے کہہ رہا تھا کہ میرا نام مفتی انعام اللہ شہابی ہے۔"

اُردو میری دُلہن ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے استفسار کیا۔

"مولوی صاحب! آپ خاصی عمر گزار چکے ہیں لیکن آپ نے اب تک شادی نہیں کی آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

مولوی صاحب نے یہ سنا تو مسکرا کر بولے

"میرے بھائی میری شادی کو تو طویل عرصہ گزر چکا ہے" دوست سخت حیرت زدہ ہوا اور بولا "آپ کی شادی کب ہوئی کس سے ہوئی اور کہاں ہوئی"؟ مولوی صاحب نے اپنے دوست کو کان قریب کرنے کے لئے کہا اور جب ان کا دوست جھکا تو مولوی صاحب نے منہ جھکا کر اس کے کان میں کہا۔

"میری شادی اُردو سے ہو چکی ہے اور اُردو ہی میری دلہن ہے"

گھوڑے اور گدھے

ایک انگریز نے حضرت خواجہ حسن نظامی سے کہا

"سارے انگریزوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں سارے ہندوستانیوں کا رنگ ایک سا نہیں ہوتا۔"

خواجہ حسن نظامی نے جواب دیا

"گھوڑوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن سارے گدھوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے۔"

داغ نماز پڑھ رہے تھے لاحول نہیں

ایک روز مشہور شاعر مرزا داغ نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ ایک صاحب ان سے ملاقات کے لئے آئے اور انہیں نماز میں معروف دیکھ کر الٹے پیروں لوٹ گئے۔ داغ نے چونکہ ان کی آہٹ سن لی تھی اس لئے سلام پھیر کر ملازم کو ان کے پیچھے

دوڑایا کر دیکھو بھاگ کر جاؤ اور انہیں واپس لاؤ۔ ملازم بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو روک کر اپنے ہمراہ لے آیا۔ داغ نے کہا حضرت آپ آئے اور چلے بھی گئے آخر کیوں؟ ان صاحب نے اپنی فطری سادگی کے تحت جواب دیا۔ "آپ چونکہ نماز پڑھ رہے تھے اس لیئے میں چلا گیا"۔ داغ نے بے ساختہ کہا "صاحب میں نماز ہی تو پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا۔"

کتابوں کی واپسی

ایک دعوت میں مہمانوں میں مارک ٹوئین اور ایک نوجوان مصنف بھی شامل تھے سارے مہمان کھانا کھا کر گھر کی آرائش و زیبائش دیکھ رہے تھے تو نوجوان مصنف نے کتابوں کی خوبصورت الماری دیکھی اور الماری کھول کر کتب کی ورق گردانی شروع کر دی اسے چند کتابیں بے حد پسند آئیں تو اس نے میزبان سے استدعا کی کہ اسے چند روز کے لئے یہ چند کتب عارتیاً دے دی جائیں۔ میزبان نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کسی صورت اپنی کتب نہ دے گا۔ نوجوان مصنف آزردہ ہوا تو مارک ٹوئین سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور وہ بولا "دوست تمہیں میزبان کے صاف انکار سے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ لوگ کتابیں عارتیاً لے جا کر پھر واپس نہیں لوٹاتے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس الماری کی ساری کتب ایسی ہی ہیں جنہیں ہمارے میزبان نے گاہے گاہے مختلف احباب سے عارتیاً لیا تھا۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے اپنی اس الماری میں بند کر لیا ہے۔"

میری اہلیہ اختر بیگم کے طبع شدہ لطائف ختم ہوئے۔

برکت کے خیال سے

حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی ایک عظیم شاعر ہونے کے علاوہ ایک صوفی بزرگ

بھی تھے۔ اس لئے صوفی منش لوگ بھی اُن کی خدمت اقدس میں حاضری دیا کرتے تھے
ایک دفعہ ایک مہمل گو شاعر جس کا حلیہ اس کے صوفی منش ہونے کی گواہی دیتا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے سفرِ حجاز کی طویل داستان بیان کرتے ہوئے بولا۔
"میں نے خانۂ کعبہ پہنچ کر برکت کے خیال سے اپنے دیوان کو حجرِ اسود پر ملا تھا"
یہ سُن کر مولانا جامی مسکرائے اور فرمایا۔
"حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ تم اپنے دیوان کو آبِ زمزم میں دھوتے"
اگر وہ ایسا کرتا تو پانی میں ڈوب کر اس مہمل گو شاعر کا سارا کلام ناپید ہو جاتا اور مولانا جامی اس کی خرافات سننے سے محفوظ رہتے۔

شاعر کو متعارف کروانے کیلئے

ایک بار مولانا عبدالرحمٰن جامی سے ملاقات کے لئے ایک شاعر آیا۔ اس غیر معروف معمولی سے شاعر کو بھی بیشتر شعراء کی طرح اپنا کلام سنانے کا مرض تھا اس نے مولانا جامی کو اپنی کئی فضول سی غزلیں پڑھ پڑھ کر سنائیں اور اُن کی ذہنی کوفت کا باعث بن گیا۔ آخر میں اس شاعر نے ایک غزل بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھی اور بولا۔
"مولانا! میری خواہش ہے کہ اس غزل کو شہر کے دروازے پر آویزاں کر دوں تاکہ ہر آتے جاتے کی نظر پڑے اور لوگوں کو پتہ چلے کہ میں بھی ایک اچھا شاعر ہوں اور وہ مجھے شاعر تسلیم کر کے میری عزت کریں۔۔۔"
مولانا جامی نے فرمایا۔

"تمہاری تجویز تو اچھی ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہ غزل تم نے لکھی ہے۔ تمہاری تجویز میں صرف اتنی سی تبدیلی کی جائے کہ تمہیں لوگوں سے متعارف کروانے کے لئے غزل کے ساتھ ہی دروازے پر لٹکا دیا جائے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔"

دروازہ کھلا چھوڑ جانے کا راز

غنی کاشمیری کشمیر کا ایک ایسا قادر الکلام شاعر تھا جسے سخنورانِ ایران بھی ایک عظیم ترین شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا ایک زندہ جاوید شعر یہ ہے۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

اسی غنی کاشمیری کی مفلسی کا یہ عالم تھا کہ دولتِ دنیا نام کی کوئی شے اس کے پاس نہ تھی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق جب تک خود گھر میں موجود ہوتا اپنے مکان کے دروازے کو مقفل رکھتا اور جب خود گھر سے باہر نکلتا تو گھر کے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ جاتا۔ ایک بار اس کے احباب نے پوچھا۔

"بھئی سمجھ میں نہیں آتا تم ایسا کیوں کرتے ہو کہ جب تک خود گھر کے اندر رہتے ہو گھر کو قفل لگا کر رکھتے ہو۔ لیکن جب خود گھر سے باہر جاتے ہو تو دروازے کو کھلا چھوڑ جاتے ہو۔؟"

غنی کاشمیری نے جواب دیا۔

"میرے گھر میں کوئی شے نہیں ہے۔ میری اپنی ذات میرے گھر کی نادادر

سب سے بیش قیمت شے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب گھر میں موجود ہوتا ہوں تو دروازے کو مقفل رکھتا ہوں۔ اور جب میں گھر سے باہر جاتا ہوں تو مجھے اپنے گھر کے بارے میں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ اس لئے میں اپنا دروازہ کھلا چھوڑ جاتا ہوں۔"

زبان کا خراب کرنا

اُستاد ذوق بیان کرتے ہیں کہ ایک روز بادشاہ نے مجھے اپنی غزل کا مسودہ دے کر کہا کہ اسے بنا دو۔ موسم برسات تھا۔ گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوان خاص میں دریا کے رخ جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد پاؤں کی آہٹ سن کر میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک دانائے فرنگ کھڑے دیکھے جو مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"دل، آپ کیا لکھتا ہے؟"

میں بولا ——— "غزل ہے۔"

انہوں نے دریافت کیا ——— "آپ کون ہے؟"

میں نے جواب دیا ——— "نظم میں حضور بادشاہ سلامت کو دعائیں دیتا ہوں۔"

بولے ——— "کس جبان میں؟"

میں نے عرض کی ——— "اردو زبان میں"

دوبارہ استفسار کیا ——— "آپ کون کون زبان جانتا ہے؟"

میں بولا ——— "عربی فارسی سے بھی واقف ہوں"

پوچھا ——— "آپ انگریزی بھی جانتا ہے؟"

میں بولا ــــ "نہیں"

جو نے ــ "کیوں نہیں سیکھا؟"

میں نے جواب دیا ــ "ہمارا لب و لہجہ اسے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے"

صاحب بولے ــ "ول کیا باٹ ہے۔ ہم آپ کا جبان بولتا ہے"

میں نے کہا۔ "جناب پختہ سالی میں غیر زبان سیکھنی مشکل کام ہے"

وہ پھر بولے ــــ "ول ہم آپ کا ٹین جبان ہنڈوستان آ کر سیکھا۔ آپ ہمارا ایک جبان نہیں سیکھ سکٹا"

میں بولا ــ "آپ کا فرمانا ہے ــــ "ہم آپ کا ٹین جبان ہنڈوستان آ کر سیکھا آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکٹا۔ بھلا یہ بھی کیا زبان ہے اور کیا سکٹا ہے؟ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے۔ اسے تو زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں"

"ذم" کے لطیفے

شاعر حضرات کلام کی ایسی بندشوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں جو رکیک معنی یا سخیف حثیت اختیار کر جائیں۔ کلام کے ایسے اسلوب سے بھی ہمیشہ بچا جاتا ہے جس میں دو لفظ یا اُن کے اجزا باہم مل کر ذم کا پہلو پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسی ترکیبیں بھی استعمال نہیں کی جاتیں۔ جن میں "راز" سے پہلے "بر" "یا" "گو" کے بعد "ز" حرفِ جار آ جائیں۔ گو شاعروں کے لئے "ذم" ایک بڑی مصیبت ہے۔ لیکن احتیاط کے باوجود بیشتر مشاہیر شعراء اس قسم کی لغزش کر بیٹھتے ہیں۔

حکیم مومن خان مومن دہلوی نے ایک مشاعرہ میں جب یہ شعر پڑھا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

تو سامعین نے "نقش پا کی" "نقش پا کی" کا شور مچا دیا۔ مومن خاں سخت شرمندہ ہوئے اور لوگوں نے فلک شگاف قہقہے لگائے۔

مضطر خیر آبادی نے ایک مشاعرہ میں جب یہ شعر پڑھا۔

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے
کہاں گیا میرا بچپن خراب کر کے مجھے

تو ایک آواز بلند ہوئی "جی بچپن کی خرابی بھی خوب رہی، قبلہ یہ بھی فرما دیجئے کہ وہ کون کمبخت تھا جس نے آپ کا بچپن خراب کر دیا تھا" یہ سننا تھا کہ محفل میں ہنسی کی لہر دوڑ گئی۔

اسداللہ غالب دہلوی نے کہا ہے۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا تیرے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا میرے آگے

اور یہ شعر

پیچھے ڈالی ہے سر رشتۂ اوقات میں گانٹھ
آگے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

ان میں چونکہ ذم کا پہلو نکلتا ہے اس لئے غالب کو ان کی بدولت بارہا خفیف ہونا پڑا تھا۔

ایک بار مرزا داغ دہلوی کے اعزاز میں بمقام لکھنؤ امین الدولہ کی بارہ دری

میں ایک مشاعرہ کی نشست ترتیب دی گئی۔ داغ نے اس مشاعرہ میں جو غزل پڑھی اس کا مطلع یہ تھا۔

جب تیرے در سے پھرا خلقت تماشائی ہوئی
آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

مطلع کا اعادہ ہونے سے قبل ہی مشاعرہ میں بے شمار لوگوں نے گردان شروع کر دی۔

آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

داغ نے یہ صورت احوال دیکھی تو غزل پڑھنی چھوڑ کر محفل مشاعرہ سے باہر نکلے اور بچتے بچاتے اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے لیکن یہ لکھنؤ تھا۔ جس کے بانکے مشہور تھے، داغ دہلوی کو محفل مشاعرہ سے نکل کر اپنی قیام گاہ تک پہنچنے میں جن گلی کوچوں سے گزرنا پڑا تھا۔ ان سب میں ہر جگہ اسی مصرعہ کی گردان سنی جاتی تھی۔

آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

علی الصبح داغ لکھنؤ دہلی سے لوٹ گئے اور انہوں نے اس مصرعہ میں بھی تبدیلی کر دی۔ لیکن یہ واقعہ تو رونما ہوا تھا۔ جس سے کسی کو انکار مجال نہیں۔

امیر مینائی کا یہ شعر

شمشیر ہے سناں ہے کسے دوں کسے نہ دوں
اک جان ناتواں ہے کسے دوں کسے نہ دوں

اس کی ردیف ایسی ہے کہ اس سے ذم کا پہلو نکلتا ہے اسی طرح مرزا داغ کی ایک اور غزل ہے۔

آزمایا ہے مدام آپ کو بس بس اجی بس
دونوں ہاتھوں سے سلام آپکو بس بس اجی بس

لوگوں نے "بس بس بس اجی بس" میں ذم کا پہلو ڈھونڈھ لیا تھا۔ اور اس کا مذاق اڑا کر خوب ہنستے تھے۔

ایک زمانہ میں مولانا سیماب اکبرآبادی کا ایک مصرع مذاق کا موجب بن گیا تھا۔ مصرع یہ تھا۔

پانی پانی ہے ندامت سے ہر اک جاپانی

غالباً یہ دوسری جنگ عظیم کی ایک نظم کا مصرع تھا۔ اس میں جاپانیوں کی مذمت کی گئی تھی لیکن اس میں جاپانی کا لفظ مضحکہ خیز بن جاتا تھا۔

بلا شک و شبہ ذم کا نقص بیشتر اساتذہ کرام کی شاعری میں پایا جاتا ہے اور لوگوں کے ہنسنے ہنسانے کا اہتمام کرتا ہے۔

لیکن برِ شیریں دارد

دہلی کی ایک مشہور طوائف شیریں جان خود تو انتہائی حسین و جمیل خاتون تھی۔ لیکن اس کی ماں سانولے رنگ کی ایک موٹی اور بھدی عورت تھی۔ ایک محفل میں شیریں جان اپنی ماں کے ہمراہ مجرے کے لئے آئی تو اس محفل میں سر سید احمد خان بھی موجود تھے اور ان کے ساتھ ان کا ایک نند ماری نوجوان دوست بھی تھا اس نند ماری نوجوان نے شیریں جان کی ماں کو دیکھا تو بولا۔

مادرش بسیار تلخ است

مرسید نے مسکرا کر اس کے جواب میں یہ مصرع پڑھا۔

گرچہ تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

مندرجہ بالا واقعہ "لطائف سرسید" اور سیر المصنفین نامی کتب سے لیا گیا ہے۔ شاید اسی شیریں جان کے بارے میں عبداللہ خان اوج نے جب شیریں جان حج کے لیے چلی تھی تو یہ شعر کہا تھا۔

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلّی حج کو چلی
شل ہے نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی

مبارک باشد

عرفی شیرازی کا اصل نام جمال الدین محمد تھا اور وہ سولھویں صدی عیسوی میں ایران و ہندوستان کا ایک ممتاز ہر دلعزیز شاعر تھا۔ گو وہ شیراز میں پیدا ہوا تھا لیکن ابھی کمسن ہی تھا کہ ہندوستان آگیا اور یہاں فیضی کے متوسلین میں شامل ہو گیا۔ لیکن یہ تعلق زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا جلد ہی ان میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

در منتخب التواریخ" میں بداؤنی نے لکھا ہے کہ ایک روز عرفی شیرازی فیضی سے ملاقات کے لئے گیا تو اس نے دیکھا کہ فیضی ایک کتے کے پلے کو پیار کر رہا ہے۔ عرفی نے سوال کیا۔

"مخدوم زادے" کا نام کیا ہے؟"

فیضی نے جواب دیا۔ "عرفی ما"

یہ سن کر عرفی بے ساختہ بول اٹھا ”مبارک باشد“

مبارک باشد کے ایک معنی تو ظاہر ہی ہیں لیکن اس سے دوسرا اشارہ فیضی کے باپ کی طرف ہے کیونکہ فیضی کے باپ کا نام شیخ مبارک تھا۔

مولانا جامی کے زمانہ کا استاد امام دین گجراتی

مولانا عبدالرحمٰن جامی کے زمانہ میں دلی نام کا ایک نیم پڑھا لکھا شخص تھا جو انتہائی سادہ، لوح اور قدرے بیوقوف بھی تھا اسے بعض لوگوں نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ وہ بھی ایک ”عظیم شاعر“ ہے نتیجہ اس کا یہ برآمد ہوا کہ دلی نے ادھر ادھر سے چند الفاظ اکٹھے کرکے بے ربط سی عبارت تیار کرکے جھوم جھوم کر پڑھنا شروع کر دیا اس کے دوستوں نے اس کا بے ربط کلام سنا تو اسے مزید بیوقوف بنانے کے لئے خوب خوب داد دی، جس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور پھر وہ ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرنے لگا۔ جہاں اس کی بے ربط عبادت سن کر یار لوگوں نے مزہ لینے کے لئے ”مکرر مکرر“ کے نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے اور قہقہے پر قہقہے بلند کرنے لگے دلی نے لوگوں کے اس تمسخر کو تو کیا ہی سمجھنا تھا۔ اُلٹا وہ یہ سمجھا کہ لوگ اس کے کلام کو بحد پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ مکرر مکرر کی آوازوں سے وہ بھی سمجھتا کہ لوگ سچ مچ اسے داد دے رہے ہیں۔ نتیجہ میں وہ بڑے فخر و انبساط کے ساتھ اپنی ایک غزل کو متعدد بار لہک لہک کر پڑھتا تھا اور پھر دوسری بے ربط غزل بھی متعدد بار سُناتا۔ آپ مولانا جامی کے زمانہ کے اس دلی نامی شخص کو آج کا استاد امام دین (مرحوم) قرار دے سکتے ہیں۔ وہی استاد امام دین گجراتی جن کا ایک مشہور مصرعہ ہے ؎

نہ رے گوڈے ہیں درد ِ جگر ما م دنیا

ترجمہ (اے امام دین میرے گھٹنے ہیں دردِ جگر کی تکلیف ہے)

ایک دفعہ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ شاعرِ اعظم دلی میاں نے مولانا جامی کی خدمت میں حاضر ہو کر استدعا کی کہ مولانا اس کے اشعار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں

مولانا جامی نے لاکھ چاہا کہ دلی کو ٹال دیں، لیکن وہ بضد رہا کہ اپنے اشعار پر مولانا جامی کی رائے لے کر جائے گا، مجبوراً مولانا جامی نے قلم اٹھایا اور ایک کاغذ پر حسبِ ذیل تحریر لکھ دی۔

در ملک الشعرا حضرت مولانا دلی نے اس بندہ حقیر جامی کے غریب خانہ میں تشریف لا کر اس کی عزت افزائی فرمائی ہے، اور بندہ ناچیز جامی کو اپنے دیوان خاص میں سے چند چھوٹے اشعار سنا کر محظوظ کیا ہے۔ مولانا دلی کے اشعار کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ اُسے نہ تو وزن کی تنگنائے میں سمو سکتے ہیں۔ اور نہ ہی طبع نازک کے ترازو میں تول سکتے ہیں

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کھلا کھلا کر ہنسا نہ کرتے تھے تبسم ہی آپ کا ہنسنا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی لطیف مذاق بھی فرمایا کرتے تھے۔

اُونٹنی کا بچہ

ایک بار ایک صحابیؓ حضور نبی کریمؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور استدعا کہ انہیں سواری کیلئے ایک اُونٹ دیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا

در میں تمہیں ایک اُونٹنی کا بچہ دوں گا۔

صحابیؓ نے ادب سے عرض کی۔

"حضورؐ اونٹنی کا بچہ سواری کے کام نہیں آسکتا۔ میرے لئے بے کار ہے میں اسے لے کر کیا کروں گا۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ کوئی اونٹ ایسا بھی ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو۔"

بوڑھی عورتیں اور جنت

ایک روز کا واقعہ ہے۔

ایک بوڑھی عورت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔

"حضورؐ میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں جگہ دے۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور کہا۔

"بوڑھی عورتوں کا تو جنت میں داخلہ بند ہے۔" یہ سن کر وہ صحابیہؓ غمگین ہو گئی اور لوٹی۔ ابھی وہ چند قدم دُور گئی تھی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضوان نے فرمایا۔

"اسے روک کر کہو کہ بوڑھی عورتیں جنت میں جواں ہو کر جائیں گی۔"

صحابیہؓ کو روک کر یہ بات کہی گئی تو وہ خوش ہو گئی۔

کیا کیا کہ مر گیا

مشہور صحابی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بھائی حضرت ابو عمیر رضہ نے ایک ممولا پال رکھا تھا۔ جو مر گیا تو اس کی خبر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوئی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر ابو عمیر رضہ سے پوچھا

"بھئی یہ تمہارے ممولے نے کیا کیا۔ کہ مر گیا۔"

حصہ آنکھ اور درد

ایک روز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھجور اور روٹی کھا رہے تھے کہ ایک صحابی رضہ آ گئے۔ آپ نے کھانے میں اس صحابی رضہ کو بھی شریک کر لیا۔ اس صحابی رضہ کی ایک آنکھ میں شدید درد تھا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی رضہ کو آنکھ کے درد میں مبتلا دیکھا تو یہ خیال کیا کہ کہیں آنکھ کے درد میں کھجور کھانے سے زیادہ اضافہ نہ ہو جائے۔ انہیں کھجور کھانے سے منع فرمایا۔ مگر اس صحابی رضہ نے عرض کی۔

"حضور آپ میرے درد کی طرف سے مطمئن رہیں، کیونکہ میں اپنی آنکھوں کے اس حصہ سے کھا رہا ہوں۔ جس میں درد نہیں ہے"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر مسکرا دیئے۔

اجازت

غزوہ تبوک جاری تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک چھوٹے سے خیمہ میں رونق افروز تھے کہ ایک صحابی رضہ آ گئے۔ حضور نبی کریم نے فرمایا۔

"خیمہ کے اندر آجاؤ"

خیمہ چونکہ بہت مختصر تھا۔ اس لئے صحابیؓ نے عرض کی۔

"حضورؐ اجازت دیں تو پورا اندر آجاؤں یا اپنا کوئی حصہ باہر بھی چھوڑ آؤں"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو مسکرائے۔

اپنی غربت کا اظہار

ایک روز ایک صحابیؓ حاضر خدمت ہوئے اور اپنے گناہ کی کہانی بیان کر کے اس کی تلافی کی صورت دریافت کی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"غلام آزاد کر دو"

وہ بولے "حضورؐ میں ایک غریب آدمی ہوں"

آپؐ نے فرمایا۔

"تو پھر روزے رکھا کرو"

وہ بولے۔ "حضورؐ اس کی جسمانی قوت نہیں ہے" عین اس وقت ایک شخص کھجوریں لایا۔ حضور نبی کریمؐ نے یہ کھجوریں اس صحابیؓ کو دے کر فرمایا۔

"ان کھجوروں کو صدقہ کر دو"

صحابیؓ نے عرض کی۔

"حضور میں اس شہر میں سب سے زیادہ مفلس و نادار ہوں" یہ سن کر آپؐ مسکرائے اور فرمایا۔

"اچھا تو ان کھجوروں کو خود ہی کھالو"

بے عقل اُستاد

جیساکہ نامور لوگوں کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے شہرت حاصل کرنے کے بعد بہت سے لوگوں نے ان کی شاگردی کے دعویٰ کر دیئے۔ مگر ایک صاحب سب سے بازی لے گئے۔ انہوں نے یہ مشہور کیا کہ وہ اکبر الہ آبادی کے استاد ہیں۔ اکبر کو اس کا پتہ چلا کر حیدرآباد میں ان کے ایک استاد نے جنم لیا ہے تو وہ بولے۔

"مولوی صاحب بالکل بجا فرما رہے ہیں۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ میرے ایام بچپن میں ایک مولوی صاحب الہ آباد میں مقیم تھے جو مجھے علم سکھایا کرتے تھے اور میں انہیں عقل دینے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مگر ہم دونوں کی بدقسمتی سے نہ مجھے علم آیا اور نہ مولوی صاحب کو عقل آئی۔"

بڑا کون ہے؟

ایک بار مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور اکبر الہ آبادی ایک جگہ اکٹھے ہوئے تو مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے بار بار مثنوی مولانا روم کا ذکر کیا۔ ایک مرحلہ پر اکبر الہ آبادی کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اور آپ بول اٹھے۔

"کیوں جناب! یہ تو فرمائیں کہ کون بڑا ہے۔ مولانا روم یا اللہ میاں؟"

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے جواب میں کہا

"اللہ میاں"

اکبرالہ آبادی بولے۔ "دو لیکن مجھے تو آپ کی گفتگو سے یہ پتہ چلتا تھا کہ شاید مولانا روم بڑے ہیں۔ کیونکہ جب سے آپ یہاں پہنچے ہیں بار بار مولانا روم کا نام لے رہے ہیں۔ اللہ میاں کا نام آپ نے ایک بار بھی نہیں لیا۔"

جوتوں کے زور سے

ایک جوتا فروش نے نئی نئی دوکان کھولی تو اکبرالہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا۔

"حضرت میں نے جوتوں کی دوکان کھولی ہے۔ کوئی شعر عطا فرمایئے"۔

اکبرالہ آبادی نے فوراً یہ شعر لکھ کر دے دیا۔

شو میکری کی کھولی ہے ہم نے دوکان
روٹی کو ہم کمائیں گے جوتوں کے زور سے

اللہ کی دین

اپنے زمانے کی نامور طوائف گوہر نے اکبرالہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر التجا کی کہ کوئی شعر اس کے لئے بھی کہا جائے۔ اکبرالہ آبادی نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر اس کے سپرد کر دیا۔

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

غلام گردش میں ہے

ایک روز مرزا غالب نجم الملک بہادر کی ملاقات کو گئے اور جب غلام گردش میں داخل ہوئے تو خدمت گار نے صاحب عالم کو مطلع کیا کہ مرزا نوشہ صاحب آ رہے ہیں صاحب عالم کسی مصروفیت کے سبب مرزا غالب کو بلانے سے معذور تھے اس لئے خاموش رہے۔ اس دوران مرزا غالب غلام گردش ہی میں ٹہلتے رہے۔ کچھ دیر بعد صاحب عالم فارغ ہوئے تو ملازم کو بآواز بلند پکار کر بولے

"ارے بھاگ کر دیکھ کہ مرزا صاحب کہاں ہیں؟"

مرزا غالب نے سنا تو وہیں سے بآواز بلند جواب دیا۔

"غلام، گردش میں ہے"

فاقہ مستی رنگ لائی

ایک دفعہ کسی بنیے نے اپنے قرض کی واپسی سے مایوس ہو کر مرزا غالب کے خلاف ڈگری کروا دی۔ بادشاہ کے دربار سے مرزا غالب کی طلبی کا پروانہ جاری ہوا تو مرزا صاحب خود تو دربار میں حاضر نہ ہوئے البتہ حکمنامے کی پشت پر یہ شعر لکھ کر بھجوا دیا۔

قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بادشاہ نے یہ شعر پڑھا تو ہنسے اور ڈگری کا سارا روپیہ شاہی خزانے سے ادا کرنے کا حکم لکھ دیا۔

بلا

ایک بار مرزا غالب اپنا رہائشی مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان خود دیکھ آئے اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا۔ لیکن وہ محل سرا نہ دیکھ سکے تھے۔ کیونکہ اس موقع پر وہاں مالک مکان کی عورتیں موجود تھیں مرزا غالب نے گھر پہنچ کر اپنی بیگم کو مکان کی محل سرا کو دیکھنے کے لئے بھیجا۔ بیگم مرزا غالب سارا مکان دیکھ کر آئیں تو مرزا نے ان سے پوچھا کہ انہیں مکان پسند ہے یا نہیں۔ بیگم مرزا غالب بولیں۔ "وہ لوگ کہتے ہیں کہ اس مکان میں بلا رہتی ہے"

یہ سنا تو مرزا غالب چہک کر بولے۔

"کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟"

باہر سے آمدہ گدھے

ایک روز مرزا غالب اور ان کا ایک مہمان کسی دعوت سے رات کو لوٹے تو ایک تنگ گلی میں ایک گدھے کو کھڑا دیکھ کر مہمان بولا۔

"مرزا صاحب! دہلی میں گدھوں کی بہتات ہے" مرزا غالب نے بے ساختہ کہا۔

"صاحب! باہر سے آجاتے ہیں"

امیر مینائی "اور گیا دین"

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں لکھنؤ کی تباہی کے بعد امیر مینائی اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ لکھنؤ سے پہلے تو کاکوری آئے۔ پھر وہاں سے کانپور آگئے۔ جہاں شیخ وحیدالزمان ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کی چھوٹی صاحبزادی حضرت امیر مینائی سے منسوب تھی ڈپٹی صاحب نے امیر مینائی کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور چند روز بعد بولے۔

"امیر احمد! گھر بیکار بیٹھے رہنے کی بجائے تم کچہری آجایا کرو تو وہاں کچھ کام سیکھ لوگے اس کے بعد تمہیں کوئی اچھی سی ملازمت مل جائے گی"

امیر مینائی اس مشورے کو ٹالتے رہے۔ مگر ایک روز ڈپٹی صاحب نے بگھی بھیج کر نوکر کو تاکید کی کہ خواہ کچھ کرو امیر احمد کو ضرور کچہری لے آؤ۔ نوکر بگھی لے کر پہنچا اور امیر احمد کو چلنے کے لئے کہا۔ امیر مینائی نے بگھی پر سوار ہوتے ہی یہ فیصلہ کیا کہ کچہری میں داخل ہوتے وقت جو آواز سنائی دے گی۔ اسی سے تعاون کریں گے۔

بگھی کچہری میں داخل ہوئی تو اتفاقاً اس وقت عدالت کا چپراسی کسی ملازم "گیا دین" نامی کو آوازیں دے رہا تھا۔ امیر مینائی کے کان میں گیا دین کے الفاظ پڑے تو اس نے خیال کیا کہ گیا دین کا مطلب ہے دین گیا۔ یعنی کچہری میں دین نہیں رہ سکتا۔ اس خیال کے تحت حضرت امیر مینائی الٹے پاؤں بگھی پر سوار ہو کر لوٹ آئے۔ شام کے وقت ڈپٹی کلکٹر صاحب گھر آئے تو انہوں نے اس واپسی کی وجہ دریافت کی تو خواجہ امیر مینائی بولے۔

"میں ایسی جگہ کام نہیں کروں گا۔ جہاں سب سے پہلے گیا دین کی آوازیں سنائی دیتی ہوں۔"

آلات نطق کی بناوٹ

سید انشا دہلوی نے "دریائے لطافت" میں لکھا ہے کہ ان کے احباب میں ایک صاحب میر غفر عینی نامی تھے۔ جن کے آلات نطق کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ وہ "ل" اور "ر" کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ ان حروف کی جگہ "غ" کی آواز نکالتے تھے "مثنوی سحر البیان" کا ایک شعر ہے۔

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

اس شعر کو میر غفر عینی اس طرح پڑھتے تھے۔

چغی کغے کو کغے سے بجاتی ہوئی۔ واں سے دامن بچاتی ہوئی۔

ان کے اسی لہجہ کے باعث لوگ انہیں میر غفر عینی کے نام سے پکارتے تھے۔

شیراز، تبریز اور کُتّے

ایک روز خواجہ ہمام الدین تبریزی تبریز کے ایک حمام میں غسل کے لئے پہنچے تو اتفاقاً وہاں شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی بھی موجود تھے۔ خواجہ ہمام نے غسل کی ابتدا کی تو شیخ سعدی نے لوٹے سے ان کے سر پر پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ خواجہ ہمام نے استفسار کیا۔

"میاں درویش کہاں سے آرہے ہو؟"

شیخ سعدی نے عرض کی۔

"شیراز سے حاضر ہوا ہوں"

خواجہ ہمام نے کہا۔

"یہ عجیب بات ہے کہ میرے شہر میں شیرازی کتوں سے بھی زیادہ (تعداد) ہیں" شیخ سعدی نے مسکرا کر کہا۔

"مگر میرے شہر میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شیراز میں تبریزی کتوں سے بھی کم (درجہ) ہیں"

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کو اپنی بیٹی زیب النساء کے لئے استاد درکار تھا یہ خبر سن کر ایران اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بیسیوں قادر الکلام بڑے بڑے شاعر دہلی آ گئے کہ شاید قسمت یاوری کرے اور وہ زیب النساء کے استاد مقرر کر دیئے جائیں۔ ان ایام میں دہلی میں اُس زمانہ کے نامور شاعر برہمن اور میر ناصر علی سرہندی بھی موجود تھے۔ نواب ذوالفقار علی خان ناظم سرہند کی سفارش پر برہمن اور میر ناصر علی سرہندی کو شاہی محل میں اورنگ زیب کے روبرو پیش کیا گیا۔ سب سے پہلے برہمن کو غزل سنانے کا حکم ہوا۔ برہمن نے تعمیل حکم میں جو غزل پڑھی اس کا مقطع یہ تھا۔

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار

بکعبہ بُردم و بازم برہمن آوردم

گو یہ محض شاعرانہ خیال تھا اور تخلص کی رعایت کے تحت کہا گیا تھا۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر کی تیوری چڑھ گئی اور وہ برہمن کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ ناصر علی نے اُس

صورت احوال پر قابو پانے کے لئے اٹھ کر عرض کی۔ حضور! اگر برہمن مکہ جانے کے باوجود برہمن ہی رہتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ سعدی بھی تو یہ کہہ گئے ہیں۔

ع خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

(عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ بھی چلا جائے تو جوں ہی وہ واپس آئے گا۔ گدھے کا گدھا ہی ہوگا)

اورنگ زیب عالمگیر نے یہ لطیفہ سنا تو اُسے ہنسی آگئی اور اس نے خوش ہو کر برہمن کے اس قصور کو معاف کر دیا۔

ایک بات

امیر مینائی کو ان کے ایک ہم عصر نے اپنا یہ شعر سنایا۔

بے حجاب اس کو کیا شوخی نے میری وصل میں
ایک بات ایسی کہی جامے سے باہر ہو گیا

یہ سن کر امیر مینائی بڑی سنجیدگی سے بولے۔
"یقیناً آپ نے نہیں بڑی ہی کہہ دیا ہوگا"

قصبے کی تعلیم

شملہ کی ایک دعوت میں اونچے سرکاری طبقے کے لوگ شریک تھے اور ان کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر بھی اپنے فقیرانہ لباس میں موجود تھے۔ اُردو میں بات چیت جاری تھی۔

اپنی کسی بات کو منوانے کے لئے مولانا محمد علی جوہر نے انگریزی بولنی شروع کر دی اور دلائل کا ڈھیر لگا دیا۔ دعوت میں شریک ایک ہندو رانی مولانا کی انگریزی زبان کی مہارت سے بڑی متاثر ہوئی اور بولی۔

"مولانا صاحب! آپ بڑی عمدہ انگریزی بول رہے ہیں آپ نے یہ کہاں سے سیکھی ہے؟ مولانا بولے۔ "میں یہ انگریزی ایک معمولی سے قصبے میں رہ کر سیکھ سکا ہوں" رانی سخت متعجب ہو کر بولی۔

"اس قصبے کا نام کیا ہے؟"

"آکسفورڈ" مولانا نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ اور ساری محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

گاندھی — ایک جرم

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی نینی تال جیل کی اسیری کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں

"میں نینی تال جیل کی جس کوٹھڑی میں اسیر تھا۔ اس کے عین بالمقابل کی کوٹھڑی میں کوئی چینی قیدی مقیم تھا۔ زبان کی بیگانگی نے ہمیں ایک دوسرے سے بیگانہ بنا رکھا تھا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھنے پہ اکتفا کئے بیٹھے تھے۔

چینی کو علم نہ تھا کہ میں کس جرم کی بنا پر قید ہوں، شاید وہ میرے جرم کے بارے میں کبھی سوچتا رہتا ہو آخر کار ایک روز وہ میرے جرم سے واقف ہونے کے لئے میرے سامنے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ لہرانے لگا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کس جرم میں جیل آئے ہو، میرا زبان سے کچھ بولنا بیکار تھا اس لئے میں نے خاموشی سادھے رکھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا۔

"اوپیم" یعنی کیا افیم کے سلسلے میں گرفتار ہوئے ہو؟" میں نے انکار میں سر کو ہلایا تو وہ اپنے ہاتھ کو اپنے گلے پر چھری کی طرح پھیرنے لگا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی کو قتل وغیرہ کر کے جیل آئے ہو۔ میں نے دوبارہ انکار میں سر کو ہلایا تو وہ بولا۔

"گاندھی"

اس کے یہ الفاظ سن کر میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس کی تسلی ہو گی اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے خیال میں گاندھی بھی افیون کی سمگلنگ اور قتل وغارتگری کی طرح جرائم میں داخل تھا۔

دھوکہ دہی

ایک روز مرزا غالب نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی۔

"جوں ہی میری روح جسد خاکی کو چھوڑ دے، تم بھاگ کر کہیں سے پرانا کفن لے آنا اور مجھے اس میں لپیٹ کر رکھ دینا۔"

شاگرد بولے۔ "استاد! یہ تو بتائیے اس سے آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

مرزا غالب نے کہا "ارے کمبختو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ جب منکر نکیر تشریف لائیں گے تو پرانے کفن کو دیکھتے ہی سوال وجواب کئے بغیر لوٹ جائیں گے۔ کیونکہ پرانا کفن دیکھ کر وہ سمجھیں گے کہ اس جگہ بھولے سے دوبارہ آگئے ہیں۔

لوڈی مسلمان کی پہچان

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مرزا غالب کی پنشن بند ہوگئی تھی اور وہ دربار میں بھی شرکت سے منع کر دیئے گئے تھے۔ ایک دن لیفٹیننٹ پنجاب کے میر منشی پنڈت موتی لال مرزا غالب کی ملاقات کو آئے اور پنشن کا ذکر چل نکلا تو مرزا غالب بولے۔

"ساری عمر میں ایک روز بھی شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو گنہگار پھر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرکار مجھے کس طرح باغی مسلمانوں میں شمار کرتی ہے۔"

میں نور بجنوری، ریاض شاہد اور وحشی مارہروی گول باغ میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے فیصلہ ہوا کہ ہر شخص دو دو لطیفے سنائے اور جس کا لطیفہ دلچسپی کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آئے وہ سب کو چائے پلائے فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے دیا گیا اور سب سے پہلے مجھے تین لطیفے سنانے کے لئے کہا گیا۔ میں نے یہ تین لطیفے سنائے۔

آمد و رفت

میں نے اپنے پوتے ندیم تسکین سے پوچھا۔

"بیٹے! کیا تم اسکول جاؤ گے؟"

ندیم بولا۔

"جی ہاں میں ضرور سکول جاؤں گا۔ اور سکول سے لوٹ کر گھر بھی آؤں گا

لیکن وہاں کسی صورت نہیں ٹھہروں گا۔"

اتنے بہت سے چمچے

ڈاکٹر نے میری بہو کو دوا دیتے ہوئے کہا

"یہ لو دو چمچے صبح" دو دوپہر دو شام کو اور دو رات کو کھانا۔

میری بہو فوراً بولی۔

"ڈاکٹر صاحب کچھ چمچے کم کر دو، کیونکہ ہمارے گھر اتنے بہت سے چمچے موجود نہیں ہیں"

میرا اتنیر السلینہ یہ تھا۔

خاتون کی عمر

"آپ کی عمر کتنی ہے؟ خیال رہے آپ حلفی بیان دے رہی ہیں" جج نے سوال کیا

"بتیس سال چند مہینے" خاتون نے سوچ کر جواب دیا۔

"چند مہینے کا کیا مطلب، مہینوں کی تعداد بتایئے" جج نے کہا۔

"جی" خاتون کچھ حساب لگا کر بولی۔ "چھیانوے مہینے"

مناسب جگہ

یہ لطیفہ نور بجنوری نے سنایا۔

ارسطائی پس ایک فلسفی تھا۔ مال و دولت کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت و وقعت نہ تھی۔ وہ زر و جواہر کو حقیر شے سمجھتا تھا۔ ایک روز اس کا ایک عقیدتمند

رئیس اُسے اپنا نو تعمیر شاندار سنگ مرمر کا محل دکھانے کیلئے لے گیا۔ محل میں گھومتے پھرتے اچانک ارسطائی پس نے رئیس کے منہ پر تھوک دیا۔ رئیس غصہ سے لال پیلا ہوگیا تو ارسطائی پس بولا۔

"ان قیمتی سنگ مرمر کے فرش اور سنگ مرمر کی شفاف دیواروں پر کیسے تھوکتا مجھے تھوکنے کے لئے تمہارے چہرے کے سوا کوئی مناسب جگہ دکھائی ہی نہیں دی"

اللہ معاف کرے

یہ لطیفہ ریاض شاہد نے سنایا۔

یہ وطن عزیز ہی کا واقعہ ہے۔

ایک مذہبی رہنما کو جلسہ میں تقریر کرنی تھی۔ کیونکہ یہ جلسہ ان کے اعزاز میں ہو رہا تھا۔ ایک وزیر نے تقریر سے قبل مذہبی رہنما کا تعارف کراتے ہوئے ان کی بہت زیادہ تعریف کی اور زمین و آسمان کے قلابے ملادیئے۔

تعارف ختم ہوا تو دینی رہنما تقریر کے لئے اُٹھا اور بولا۔

"اللہ تعالیٰ وزیر صاحب کو اُن کی مبالغہ آمیزی پر معاف کرے اور مجھے بھی اپنی تعریف سُن کر لطف اندوز ہونے پر"

اور اس لطیفہ کے بعد وحشی مارہروی نے یہ لطیفہ سنایا

اعلیٰ تعلیم کی قدر و قیمت

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی حمایت میں جلسہ منعقد تھا ایک مقرر نے اپنی تقریر

شروع کی :

"میں خواتین و حضرات میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے زیادہ حامی ہوں کیونکہ جب میں چوتھی جماعت میں زیر تعلیم تھا تو مجھے کہا گیا کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی تمہیں ملازمت مل سکتی ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ اچھی نوکری حاصل کرنے کے لئے بی اے ہونا ضروری ہے۔ میں گریجوایٹ بن گیا تو یہ کہا گیا کہ اب ماسٹر ڈگری حاصل کرو، ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا گیا کہ اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لئے ماسٹر ڈگری کے بعد کسی مضمون میں مہارت حاصل کرنا لازمی ہے۔ میں اپنے مضمون میں ماہر ہو کر ملازمت کی تلاش میں نکلا۔ تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ملازمت دینے کے ادارے کسی نوجوان آدمی کو تلاش کر رہے ہیں"

مجھے تینوں لطیفے پسند تھے۔ اور میرے لئے یہ فیصلہ کرنا ممکن نہ تھا کہ کس لطیفہ کو نمبری پوزیشن دوں، اس لئے میرے اس فیصلے کو میرے تینوں دوستوں نے قبول کر لیا کہ تینوں لطیفے بہت اچھے ہیں، اس لئے میں اپنی گرہ سے اپنے دوستوں کو چائے پلا رہا ہوں۔ اور ہم تینوں نے نگینہ بیکری میں بیٹھ کر ایک بار پھر لطیفہ بازی کی۔

بزرگوں کا ایک قول

ایک دفعہ سر سید (مرحوم) مولانا شبلی نعمانی (مرحوم) اور مولوی ممتاز علی (مرحوم) ایک جگہ باتوں میں مصروف تھے۔ اتفاقاً سر سید کا ایک ضروری کاغذ ادھر ادھر ہو گیا۔ انہوں نے بہت تلاش کیا لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اب تو سر سید سخت پریشان ہو گئے۔ اتفاقاً یہ کاغذ مولانا شبلی نعمانی کو نظر آ گیا اور

انہوں نے سر سید کو ستانے اور ذرا تماشہ دیکھنے کے لئے کاغذ کو اپنے ہاتھ کے نیچے چھپا لیا۔ سر سید تاڑ گئے کہ مطلوبہ کاغذ مولانا شبلی نے اپنے ہاتھ کے نیچے دبایا ہوا ہے۔ سر سید نے مولانا شبلی سے مسکرا کر کہا۔

"بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جو شے گم ہو جائے اسے شیطان اپنے ہاتھ کے دبا کر بیٹھ رہتا ہے۔ اور وہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی ہے"

یہ کہہ کر سر سید نے قدرے توقف کیا۔ ادھر اُدھر دیکھا جیسے کاغذ کو تلاش کر رہے ہوں، پھر اچانک بولے۔

"مولانا! ذرا دیکھئے تو کہیں میرا کاغذ آپ کے ہاتھ تلے تو نہیں آ گیا؟"

مجبوراً مولانا شبلی کو ہاتھ اٹھانا پڑا اور جب وہ کاغذ نظر آیا تو سب کے لبوں پر ہنسی دوڑ گئی۔

سر سیدؔ قومی کشتی کے ناکتخدا

محمڈن کانفرنس کا جلسہ منعقد تھا۔ شرکا میں سر سیدؔ، شبلی، حالی، نواب محسن الملک نواب وقار الملک اور نذیر احمد سے مشاہیر شامل تھے۔

پنجاب کے ایک خطاب یافتہ بڑے زمیندار نے جوش و خروش کے عالم میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"سر سید ہماری قومی کشتی کے ناکتخدا ہیں"

محفل قہقہوں سے گونج اٹھی اور سر سید بھی اپنی ناکتخدائی کے اس ذکر پر ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔

باعثِ حیرت

افغانستان کے نادر خان لاہور آئے تو علامہ اقبالؒ کو دیکھ کر از حد متعجب ہوئے اور بولے۔

"کیا آپ اقبال ہیں؟ میرا تو خیال تھا کہ آپ ایک لمبی داڑھی والے بزرگ صورت انسان ہوں گے"۔ علامہ اقبالؒ نے جواب میں فرمایا۔

"آپ سے بہت زیادہ حیرت زدہ میں ہوں، کہ میرا تو خیال یہ تھا کہ آپ جرنیل ہیں مضبوط و دیو ہیکل ہوں گے، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ تو انتہائی دبلے پتلے انسان ہیں آپ ہی جرنیل ہیں تو کوئی بھی بات نہیں ہے"۔

وطن کی بہنیں

اخبار "وطن" کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں کے علامہ اقبالؒ سے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ علامہ اقبالؒ کی اس دور کی قیام گاہ واقع انارکلی بازار لاہور اکثر جایا کرتے تھے۔ اس دور میں انارکلی بازار میں طوائفیں آباد تھیں۔ چند روز بعد میونسپل کمیٹی نے طوائفوں کو انارکلی بازار سے اندرون شہر موتی بازار اور چوک چکلہ منتقل کر دیا۔ ان ایام میں جب بھی مولوی انشاء اللہ علامہ اقبال سے ملاقات کے لئے آئے تو انہیں پتہ چلا کہ علامہ صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے، باہر گئے ہوئے ہیں۔

ایک روز مولوی انشاء اللہ پہنچے تو علامہ اقبالؒ گھر پر موجود تھے۔ مولوی

انشاء اللہ نے ازراہ مذاق کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! جب سے طوائفیں انار کلی بازار سے کہیں دوسری جگہ منتقل ہوئی ہیں۔ آپ کا دل بھی انار کلی میں اپنے گھر پر نہیں لگتا"

علامہ اقبالؒ نے فوراً جواب میں کہا۔

"مولوی صاحب! آخر کیوں نہ خیال کیا جائے، وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہیں"

مولوی انشاء اللہ نے یہ سنا تو کٹ کر رہ گئے۔

فحش کلامی سے پرہیز

برصغیر پاک و ہند کے نامور ادیب اور اپنے زمانہ کے بہترین ادبی رسالے "ساقی" کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی کو جب خدمت علم و ادب کے عوض فاقہ کشی ملی تو انہوں نے راگ راگنیوں سے جو شوقیہ دلچسپی قائم کی تھی۔ وہ ان کی گزر بسر کا وسیلہ بن گئی اور مولانا شاہد احمد دہلوی (مرحوم و مغفور) پاکستان پہنچنے کے بعد کراچی ریڈیو سے گانے گاتے تھے اور گاہے گاہے موسیقی کے سبق بھی نشر کرتے تھے۔ اس دور کی حکومت نے پروگراموں کے درمیانی وقفوں میں مختلف نوع کے اقوال نشر کرنے کا حکم جاری کر رکھا تھا۔ مثلاً پروگرام کے بعد جگہ جگہ نہ تھوکیے۔ جھوٹ کبھی نہ بولئے۔ ہمیشہ سچ بولیے وغیرہ نشر ہوا کرتا تھا۔

ایک شام کا واقعہ ہے۔ مولانا شاہد احمد دہلوی کا گانا نشر ہو چکا تو اناؤنسر بولا۔

"ابھی ابھی شاہد احمد حفیظ جالندھری کا کلام سنا رہے تھے" اور اس کے ساتھ اناؤنسر نے یہ مقولہ بھی نشر کیا۔

"فحش کلامی سے پرہیز کیجیے"

یہ اناؤنسر میرزا یاس یگانہ چنگیزی کے فرزند تھے۔ جب مولانا شاہد احمد دہلوی کو اپنے گانے کے بعد فحش کلامی سے پرہیز کرنے کی تلقین کے اس اتفاقی مذاق کا علم ہوا تو آپ نے کہا۔

"کاش! اس برخوردار نے یہی نصیحت اپنے بزرگوار کو کی ہوتی"

اس حادثہ کے بعد اقوال نشر کرنے کا دستور ترک کر دیا گیا تھا۔

ہے تو یہ ایک لطیفہ ہی، لیکن اگر آپ چاہیں تو اپنی قوم کی کم فہمی بے حسی اور اس دور کے برسراقتدار طبقے کی علم دشمنی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جس کے عہد میں مولانا شاہد احمد دہلوی سے لائق فائق ایڈیٹر بے مثل عالم اور صحیح معنوں میں دانشور کو اپنی گزر بسر کے لئے ریڈیو سے گانا پڑا تھا۔ اگر مولانا شاہد احمد نے شوقیہ طور پر راگ راگنیوں سے دلچسپی نہ لی ہوتی تو کون جانے انہیں پیٹ بھرنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا۔

موٹر میں کتے آئے

فقیر سید وحید الدین کے ایک عزیز علی، متمول لوگوں کی طرح کتے پالنے کے بے حد شوقین تھے۔ ایک روز وہ لوگ حضرت علامہ اقبالؒ کی ملاقات کے لئے آئے تو ان کے ساتھ موٹر میں کتے بھی موجود تھے۔ وہ لوگ موٹر سے اتر کر چلے گئے تو اُن کے کتے موٹر ہی میں موجود رہے۔ اس دوران علامہ اقبالؒ کی ننھی منی صاحبزادی منیرہ نے کتوں کو موٹر میں بیٹھے دیکھا تو بھاگ کر اپنے والد کے پاس آئی اور انہیں یہ خبر دی۔

"ابا ابا موٹر میں کتے آئے ہیں"

علامہ اقبالؒ نے اپنے سامنے بیٹھے احباب پر نظر ڈال کر فرمایا۔

"نہیں بیٹیا! یہ تو آدمی ہیں"

بلا وجہ بھاگ دوڑ

حضرت مولانا ظفر علی خاں نماز فجر کی ادائیگی کے فوراً بعد ورزش کیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں میلوں تک پیدل ہی دوڑتے چلے جاتے تھے۔ ایک روز علی الصبح مولانا ورزشی دوڑ لگا رہے تھے تو ایک پولیس مین کو ان پر کچھ شبہ ہوا لہٰذا اس نے اپنا شبہ دور کرنے کے لیے مولانا کو آواز دی۔ مولانا نے پولیس والے کی آواز سُنی تو ازراہ مذاق سرپٹ بھاگ نکلے۔ سپاہی نے فوراً ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اب آگے آگے تو مولانا ظفر علی خان سرپٹ بھاگ چلے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے وہ سپاہی دوڑ رہا تھا۔ آخر کار کچھ دیر کی بھاگ دوڑ کے بعد مولانا اپنے دفتر اخبار "زمیندار" میں داخل ہوئے تو سپاہی بھی آپ کے پیچھے پیچھے دفتر پہنچا اور مولانا کو پہچان کر سخت مایوس ہوا اور بولا۔

"مولانا! اگر آپ ٹھہر کر اپنا تعارف کرا دیتے تو میں بلا وجہ آپ کے پیچھے بھاگ کر پریشان نہ ہوتا"

یہ سُن کر مولانا ظفر علی خان مسکرا دیئے اور خاموش رہے۔

خدا کے نام درخواست

پنجاب کے ایک پیر صاحب حضرت علامہ اقبال رح کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا۔

"کہا جاتا ہے کہ آج کل حکومت لوگوں کو مفت زمین دے رہی ہے، میری خواہش ہے کہ میں بھی کچھ زمین لوں، آپ مجھے ایک درخواست لکھ دیں، مہربانی ہو گی"

حضرت علامہ اقبال رح نے فرمایا۔

"لکھنے کو تو میں درخواست لکھ دیتا ہوں، لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ درخواست کس کے نام لکھنی ہو گی؟"

غالباً پیر صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی، جب وہ خاموش رہے تو علامہ اقبال رح نے فرمایا۔

"ایک مشہور کتاب قرآن مجید کے نام سے موسوم ہے اس کتاب کو اللہ میاں نے اپنے محبوب پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا تھا۔ اس کتاب میں درج ہے کہ زمین کا مالک خدا ہے، اس لئے اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اللہ تعالیٰ کے نام درخواست لکھنے کے لئے تیار ہوں"

دل کی جلن

شاعر اردو بان حضرت اختر شیرانی اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے شراب پی

رہے تھے کہ اس دوران اُن کا ایک زاہد دوست آگیا۔ اختر شیرانی (مرحوم) نے اپنے معمول کے مطابق بوتل سے شراب پیگ میں انڈیلی اور سوڈا یا پانی ملائے بغیر حلق سے نیچے اتار لی۔ یہ دیکھ کر وہ زاہد دوست بولا۔

"براہِ کرم پیتے ہوئے اس خانہ خراب میں سوڈا یا پانی ضرور ملا لیا کریں۔ اس طرح نیٹ پینے سے دل جلتا ہے"

اختر شیرانی (مرحوم) نے مزید نیٹ پیگ حلق سے نیچے اتار کر کہا۔

"مولانا! خدا ہی کو علم ہے کہ میرے نیٹ شراب پینے سے دراصل کس کا دل جلتا ہے"

اعلانِ نبوت

یہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے تاریخی مشاعرے کا ذکر ہے جس میں ملک کے تقریباً سارے نامور شعراء نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ کے شرکاء میں سے مولانا حالی تو بہت بوڑھے تھے اور ان کے برعکس علامہ اقبالؒ کا شمار نوجوان شعراء میں ہوتا تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا اور جب مولانا حالی کی باری آئی تو انہوں نے ایک کاغذ جس پر اُن کا کلام درج تھا اپنے قریب بیٹھے ہوئے حضرت علامہ اقبالؒ کی طرف بڑھا دیا۔ علامہ اقبالؒ کاغذ ہاتھ میں لے کر اُٹھے اور سامعین پر ایک نظر ڈال کر بآواز بلند فرمایا۔

گویا کہ میں نبی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لوگوں نے غیر متوقع مصرع سُنا تو سخت حیران ہوئے اور ابھی اس مصرع

کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ حضرت علامہ نے دوسری بار فرمایا۔

گویا کہ میں نبی ہوں . . . .

اب تو حاضرین میں ناگواری سے پھیلنے لگی اور کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ نبوت کے جھوٹے عہدیداروں کو برا بھلا کہنے اور ربا اوقات جہنم رسید کرنے تک پر آمادہ رہتے تھے۔ اس سے قبل کہ لوگ حضرت علامہ اقبالؒ کے اس دعوئی نبوت کے خلاف لب کشائی کرتے اور کوئی عملی قدم اٹھاتے۔ آپ نے باآواز بلند پڑھا۔

گویا کہ میں نبی ہوں اشعار کے خدا کا
قرآن بن کر اترا مجھ پر کلام حالیؔ

یہ سن کر حاضرین نے کھڑے ہو ہو کر داد دی، تالیاں بجائیں اور تعریفی کلمات سے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

صحیح بخاری اور کلامِ مجید

کرنل مجید ملک نے پطرس بخاری کو مشورہ دیا۔

"آپ جب بھی اپنے مضامین کا مجموعہ چھپوائیں، اس کا نام "صحیح بخاری" رکھیں"

پطرس بخاری نے جواب میں کہا

"آپ جب بھی اپنی نظموں کو کتابی صورت میں چھپوائیں تو اس کا نام "کلامِ مجید" رکھیں۔

دُوں جوتا

کانگرس سے علیحدگی کے بعد ایک روز حضرت مولانا ظفر علی خان بازار میں جوتیں کی ایک دوکان پر کھڑے تھے کہ آپ کو سامنے سے کانگرس کا ایک جلوس آتا نظر آیا۔

مولانا ظفر علیخان نے فی البدیہہ یہ شعر ارشاد فرمایا۔

کانگرس آ رہی ہے ننگے پاؤں
جی میں آتا ہے بڑھ کے دُوں جوتا

بدتمیزی

نواب سائل دہلوی اور مولانا بیخود دہلوی کبھی ایک مشاعرے میں اکٹھے کلام نہ سناتے تھے۔ اتفاقاً دونوں اساتذہ کرام ایک مشاعرے میں باقی رہ گئے۔ مولانا بیخود نے اپنی غزل نکالی اور پڑھنا چاہا کہ یکلخت نواب سائل دہلوی نے انہیں روکا اور فرمایا۔

"دیکھو یہ بدتمیزی نہ کرو"

استاد بیخود دہلوی نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا اور غزل جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم ہی بدتمیزی کر لو"

شعر کی خامی

جگر مراد آبادی کے ایک شعر کی تعریف کرتے ہوئے ایک زندہ دل نے ان سے کہا۔

"حضرت! آپ کی غزل کے اس شعر کو لڑکیوں کی ایک محفل میں پڑھنے کے بعد میں بڑی مشکل سے پٹنے سے بچا ہوں"

جگر صاحب ہنس کر بولے۔

"عزیزم! میرا خیال ہے کہ اس شعر میں کوئی خامی رہ گئی ہوگی ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ آپ کو مارا پیٹا نہ جاتا۔"

حسرت لغت ہیں اور منٹو ایک فحش ناول

ایک صاحب نے مولانا چراغ حسن حسرت کو بتایا

"سعادت حسن منٹو نے آپ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے

"چراغ حسن حسرت تو محض ایک ایسی لغت ہیں جو مشکل الفاظ کے معنی دیکھنے کے کام آسکتی ہے"

مولانا حسرت غصہ سے بے تاب ہو کر بولے

"اور منٹو ایک ایسا فحش ناول ہے جس کا مطالعہ جنسی یتیموں کو اپنی پیاس بجھانے میں مدد دیتا ہے۔"

کیوں نہیں

ایک مشاعرہ میں فراق گورکھپوری اپنا کلام پڑھ چکے تو سامعین نے ایک نوجوان شاعر زبیر رضوی کا کلام سننے کی فرمائش کردی۔

مشاعرے کے سیکریٹری نے زبیر رضوی کو مائیک پر آنے کی دعوت دی تو زبیر رضوی نے مائیک پر آکر پوری نیاز مندی سے جھجکتے ہوئے کہا

"مکرم و محترم حضرت فراق گورکھپوری کے بعد میں اپنے شعر کیسے سنا سکتا ہوں"

فراق گورکھپوری نے یہ سنا تو بڑی نیاز مندی سے بولے۔

"واہ میاں واہ! تم میرے بعد جنم لے سکتے ہو تو میرے بعد شعر بھی پڑھ سکتے ہو"

تخلص کی آڑ میں

مشہور مزاحیہ شاعر حضرت احمق پھپھوندوی کو ایک ایسے مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا جس کے شرکا میں ان کے ناپسندیدہ شاعروں کی کثرت تھی حضرت احمد پھپھوندوی نے اپنے تخلص کی آڑ میں یہ قطعہ پڑھا۔

ادب نوازیٔ اہلِ ادب کا کیا کہنا
مشاعروں میں اب احمق بلائے جاتے ہیں

ریل کے کھمبے

ایک روز جوش ملیح آبادی نے جگر مرادآبادی سے مذاق کے موڈ میں کہا ۔

"آپ کو دیکھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے ۔ شراب آپ کو شدسے مولوی بنا چکی ہے ۔ اور آپ اپنے مقام کو فراموش کئے بیٹھے ہیں ۔ ایک ہم ہیں کہ ریل کے کھمبے کی مانند آج بھی اپنے اسی مقام پہ کھڑے ہیں جہاں آج سے کئی برس قبل کھڑے تھے ۔"

جگر صاحب مسکراکر بولے ۔

"بلا شک وشبہ آپ ریل کے کھمبے ہی ہیں اور ہماری زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ریل گاڑی کی طرح آپ جیسے ہر کھمبے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے ہی آگے اپنا مقام بناتی ہوئی رواں دواں ہے ۔"

چشم دید

ادبا ، شعرا کی ایک محفل میں بحث جاری تھی ، ایک بولا ۔

"قلمکار کو ہمیشہ چشم دید چیزوں کے بارے میں لکھنا چاہیئے ، اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اس کے ادب کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہ ہوگا ۔"

اس محفل میں ساحر لدھیانوی (مرحوم) بھی شریک تھے انہوں نے یہ بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا ۔

"میں اپنے چشم دید تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اُردو زبان کے قلمکاروں کے متعلق یہ کہنا درست نہیں ہے ۔ اُردو میں آج تک وہی چیزیں ایسی لکھی گئی ہیں

جنہیں ہم معیاری قرار دے سکتے ہیں. کرشن چندر کی کہانی" ان داتا" جو قحط بنگال کے بارے میں ہے اور ساحر لدھیانوی کی نظم "تاج محل" لیکن سچی بات یہ ہے کہ نہ تو کرشن چندر کو آج تک بنگال جانے کا اتفاق ہوا ہے اور نہ میں خود ابھی تک تاج محل دیکھ سکا ہوں."

اصلی رنگ

ایک مشاعرے میں سردار جعفری نے اپنی باری آنے پر کہا.

"حضرات! اب آپ عاشقانہ رنگ میں کچھ اشعار سنیے حالانکہ میرا اصلی رنگ یہ نہیں ہے"

جگن ناتھ آزاد نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا اصلی رنگ معشوقانہ ہے"

موذیوں کا موذی

حضرت یاس یگانہ چنگیزی نے ایک مشاعرے میں اپنی غزل سنا کر جب مقطع پڑھنا شروع کیا.

پڑ سکے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے\
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

یہ سن کر ایک زندہ دل نے پہلے مصرعہ میں ترمیم کر کے یہ کہا.

مرزا یگانہ خود موذیوں کے موذی ہیں\
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

مشاعرہ ہال میں قہقہے گونج اُٹھے۔

غلط کو غلت

علامہ اقبالؒ نے بچپن میں استاد کے املا لکھوانے پر "غلط" کو "غلت" لکھ دیا۔ "ط" کی جگہ "ت"، لکھا تو اُستاد بولے۔

"غلط ہمیشہ ط سے لکھنا چاہیئے۔"

علامہ اقبالؒ بولے۔ "جناب محترم! غلط کو غلت ہی لکھا جائے تو ٹھیک ہوگا"

پنشن یافتہ معشوق

دہلی کلاتھ مل کے ایک مشاعرے میں فراق گورکھپوری نے اپنی غزل پڑھنے سے پہلے کہا۔

"میری اس غزل کا مخاطب ایک پرانا پنشن یافتہ معشوق ہے"

یہ سُن کر گوپی ناتھ امن بولے۔

"اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جب معشوق پنشن یافتہ ہے تو فراق صاحب کس منزل پر ہیں۔"

کس کی تصویر

جوش ملیح آبادی اپنے ایک دوست کے گھر بیٹھے ان کی تصویروں کا البم دیکھ رہے تھے۔ دوست نے ایک تصویر دکھا کر جوش صاحب سے پوچھا۔

"بھلا بتایئے تو یہ کس کی تصویر ہے؟"

جوش صاحب بولے۔

"بھئی مجھے تو کوئی احمق شخص معلوم ہوتا ہے" دوست نے یہ سنا تو گردن جھکا کر خاموش ہو رہا، جوش صاحب کو کچھ شک گزرا بولے۔

"بھئی بتاؤنا آخر یہ تصویر کس کی ہے؟"

دوست نے آہستہ سے کہا۔

"میرے والد صاحب کی"

بڑا پاگل خانہ

سعادت حسن منٹو لاہور کے پاگل خانہ میں داخل ہو گئے تھے انہوں نے جب اپنی مے نوشی پر قابو پا لیا تو پاگل خانہ سے اپنے گھر آ گئے۔ بعض دوست احباب مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر پہنچے تو منٹو (مرحوم و مغفور) نے فرمایا

"عزیز سچی بات یہ ہے کہ میں چھوٹے پاگل خانہ سے نکل کر بڑے پاگل خانہ میں آگیا ہوں"

خودکشی

ایک دوست نے سعادت حسن منٹو سے کہا۔

"منٹو صاحب! پچھلی بار جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ کی زبانی یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی تھی کہ آپ نے شراب نہ پینے کا عہد کر لیا ہے۔ لیکن آج مجھے یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا ہے کہ آج آپ نے پھر شراب پی رکھی ہے"

سعادت حسن منٹو بولے۔

"بھئی تم درست کہہ رہے ہو۔ اس دن اور آج کے دن میں فرق صرف یہ ہے کہ اس دن تم خوش تھے اور آج میں خوش ہوں"

آخرت کی فکر

مولانا حضرت ماہر القادری سے راقم الحروف کی پرانی شناسائی تھی، ۱۹۴۰ء میں جب راقم نے بمبئی سے ہفت روزہ "آرٹسٹ" کی اشاعت شروع کی تو اس کے شاعر خاص مولانا ماہر القادری تھے، جن کی غزلیں اور نظمیں میں ایک ایک صفحے پر نمایاں شائع کرتا تھا۔

راقم ۱۹۴۹ء میں کراچی گیا تو مولانا ماہر القادری ایک صاف ستھرا رسالہ "فاران" نکالا کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں میری منتخب افسانوں کی ایک تالیف بنام "نئی راہیں" شائع ہوئی تھی جس میں اس دور کے صف اول کے افسانہ نگاروں مثلاً کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی وغیرہ وغیرہ کا ایک ایک افسانہ شائع ہوا تھا اور ان سارے افسانوں میں جنس کا نمایاں ذکر تھا۔ جس نے افسانوں کو رنگین بنا دیا تھا۔

اب ۱۹۴۹ء میں کراچی پہنچنے پر ایک روز میں مولانا ماہر القادری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملے، بڑی خاطر تواضع کی اور اصرار کر کے رات کے کھانے پر روک لیا۔ کھانے کے بعد مولانا ماہر القادری نے بڑے مشفقانہ لہجہ میں فرمایا،

"آپ سے دیرینہ تعلقات ہیں اس کے لئے بلا تکلف یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ مجھے آپ کی تالیف "نئی راہیں" سخت ناپسند تھی۔ انسان کو ہمیشہ آخرت کا خیال رکھنا چاہیئے اور فحاشی پھیلانے سے باز رہنا چاہیئے میں نے عرصہ سے آپ کی کوئی تخلیق نہیں پڑھی، لیکن میں اُمید رکھتا ہوں کہ اب آپ ایسی چیزیں نہیں لکھ رہے ہوں گے جن میں رنگین بیانی کی مد میں فحش نویسی سے جا ملتی ہیں"

راقم نے بڑی شرمساری سے عرض کی۔

مولانا! "نئی راہیں" مرتب کرنے کا خیال آیا تو ابتدا میں میرا ارادہ یہی تھا کہ اس میں ایسے افسانے شامل کروں جن میں پند و نصائح ہو، لیکن اس دور میں رسالہ "مست قلندر" لاہور میں آپ کے تحریر کردہ ناول "حرامزادے کی سرگزشت" کی کئی اقساط پڑھ کر میرا ارادہ بدل گیا تھا اور "نئی راہیں" میں جنسی کہانیاں شامل کرنی پڑی تھیں"

یاد رہے مولانا ماہر القادری نے ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء لاہور کے ایک ماہنامے "مست قلندر" مالک و مدیر ڈاکٹر پرتھوی سنگھ میں ایک ناول بنام "حرامزادے کی سرگزشت" اقساط میں لکھا تھا اور اس ناول کا ہیرو حرامزادہ واقعی حرامزادہ عیاش تھا۔

یہ واقعہ قیام پاکستان سے قبل کا ہے اور اسے مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف نے راقم کو بمبئی میں سُنایا تھا۔ شاہد لطیف بولے۔

ارادے کی تبدیلی

عصمت اپنے افسانے لحاف پر مقدمہ کے سلسلے میں لاہور گئی تھی تو مشہور ادیب میاں ایم اسلم کے ہاں قیام پذیر ہوئی تھی۔ میاں ایم اسلم نے بڑی خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور رات کو جب سب کھانا کھا چکے تھے تو فرمایا تھا۔

"عصمت تم تو واقف ہی ہو گی کہ تمہارے بھائی عظیم بیگ چغتائی جب بھی لاہور تشریف لائے، ہمیشہ میرے ہی ہاں ٹھہرے، کیونکہ ہمارے مابین برادرانہ تعلقات قائم تھے۔ اس طرح تم بھی میری چھوٹی بہن ہوتی ہو۔ اس لئے میں بڑے بھائی کی حیثیت سے تمہیں کہتا ہوں کہ شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کو ایسی کہانیاں لکھنے سے باز رہنا چاہیئے جو انہیں کچہری تک پہنچا دیں۔ اب تم خود ہی غور کرو کہ ایک بھائی کے لئے کس قدر شرم کا مقام ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کسی فحش کہانی لکھنے کی پاداش میں......"

میاں ایم اسلم نے ابھی اپنا فقرہ مکمل نہ کیا تھا کہ عصمت نے ان کی بات کاٹ کر کہا

"بھیا! ابتداء میں سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ چڑے چڑیوں کی کہانیاں لکھتی رہوں گی۔ لیکن جب میں نے آپ کی کتاب "گناہ کی راتیں" پڑھی تھی تو مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا تھا"

آٹوگراف بک ایک اصطبل ہے

یہ بھی بمبئی ہی کا واقعہ ہے، مشہور مغنیہ بائی جون بائی کے ہاں مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی تو اس کے شرکاء میں حضرت جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، جگر مراد آبادی، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، شکیل بدایونی اور دوسرے بیسیوں چھوٹے

بڑے شعراء شامل تھے۔

مشاعرے کے اختتام پر بائی جدن بائی جس کی عمر ان ایام میں کم از کم پچپن برس تھی اکی بیٹی نامور اداکارہ نرگس (بعمر ۱۳ یا ۱۴ برس) نے ایک مختصر سسی آٹوگراف پر شاعروں کے دستخط لینے شروع کئے۔

آٹوگراف جگر مرادآبادی کے سامنے آئی تو انہوں نے بائی جدن بائی (بوڑھی مغنیہ اور اس کی بیٹی نرگس (کمسن لڑکی) کے تضاد کو پیش نظر رکھا اور آٹوگراف میں لکھا۔

ازل ہی سے چمن بندِ محبت
یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے
کلی کوئی جہاں پہ کھل رہی ہے
وہیں اک پھول مرجھا رہا ہے

حفیظ جالندھری نے اپنی باری پر کمسن نرگس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر لکھا۔

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولے میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے!

آٹوگراف بک دوسرے شعراء سے ہوتی ہوئی جوش ملیح آبادی کے پاس آئی تو انہوں نے صرف یہ سطر لکھی۔

"آٹوگراف بک ایک ایسا اصطبل ہے جس میں گدھے اور گھوڑے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں"

اصل بات یہ تھی کہ جگر اور حفیظ کے برمحل شعر تو جناب جوش کو پسند آئے تھے لیکن دوسرے متعدد شعراء کے اوٹ پٹانگ شعروں نے انہیں بور کر دیا تھا۔

لطیفوں کی بہترین کُتب

- علمی وادبی لطیفے ——— قمر تسکین
- اُردُو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری ——— پرکاش پنڈت
- قہقہے ہی قہقہے ——— سعید اے شیخ
- عوامی لطیفے ——— سعید اے شیخ
- قہقہہ لگائیے ——— سعید اے شیخ
- وہ آئی ہنسی ——— سعید اے شیخ